8/

7=50
30=00
5=00
42=50

365=00
884=00
300=00
1549

1400

عورت اور اسلامی تعلیم

مالک رام - ایم اے

عورت اور اسلامی تعلیم

از

مالک رام - ایم اے

"دنیا کی بہترین متاع ایک صالحہ عورت ہے"

(حدیث نبوی)

فہرست

پہلا باب

بیٹی

دوسرا باب

بیوی

تیسرا باب

چوتھا باب

مطلقہ - بیوہ

پانچواں باب

وارثہ

تعارف

کئی سال اس طرح کی بات ہے کہ یہ کتاب بالاقساط نگار میں شایع ہوئی تھی اور اس وقت اس کے فاضل مصنف کو اسے کتابی صورت میں شایع کرنے کا خیال بھی نہ تھا لیکن بعد کو اس موضوع پر ان کا مطالعہ برابر جاری رہا اور اس میں اتنا زیادہ اضافہ ہو گیا کہ اُسے علیحدہ کتابی صورت میں شایع کرنا ہی مناسب خیال کیا گیا۔

اس کے مصنف پنجاب کے ایک نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت کم سنی سے اُنھیں سنجیدہ مطالعہ کا شوق تھا۔ اس لیے اُنھوں نے انگریزی کے ساتھ فارسی و عربی کی تحصیل بھی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ بیک وقت ادب و مذہب دونوں کا ذوق ان میں پیدا ہو گیا۔

ایک طرف اگر وہ غالب و مومن مطالعہ میں مصروف رہتے تھے تو دوسری طرف وہ براہ راست مطالعہ قرآن سے اسلامی تعلیمات جاننے کی بھی کوشش کر رہے تھے۔

آخری بار (اب سے ۱۵-۱۶ سال قبل) جب میں ان سے دہلی میں ملا تھا تو وہ غالب پر کافی کام کر چکے تھے اور مومن کے متعلق بھی ان کی تعمیر کی کوشش جاری تھی اس کے بعد وہ بہ سلسلۂ ملازمت ہندوستان سے باہر ایسے ممالک میں پہنچ گئے جہاں ان کو عربی زبان اور عربی لٹریچر مطالعہ کا بڑا اچھا موقعہ ہاتھ آ گیا اور آخر کار وہیں اُنھوں نے اس کتاب کو مرتب کیا۔

مالک رام صاحب نے تعلیمات اسلام میں خصوصیت کے ساتھ اسی موضوع کو کیوں پسند کیا، اس کا علم تو مجھے نہیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ اس طرح "عورت" اور عورت کے ذکر سے اُن کے ادبی ذوق کی بھی ایک حد تک تسکین ہوتی تھی۔

عورت کے باب میں اسلام و تعلیمات اسلام پر غور کرنا آج کل بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اگر ایک طرف عورت کی آزادی نامناسب حد تک بڑھ کر، دنیا کے معاشرتی نظام کو درہم برہم کر رہی ہے تو دوسری طرف جنس لطیف کے ترقی و اصلاح کے حامی بالکل یہ غلط خیال قائم کیے ہوئے ہیں کہ عورت پر سب سے بڑا احسان کرنے والے وہی ہیں، اور اس سے قبل دنیا کی

دوسری قوموں اور خصوصیت کے ساتھ اسلام نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

مالک رام صاحب کی یہ کتاب اس غلط خیال کی تردید ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عورت پر اسلام کے غیر معمولی احسانات ہیں اور جس ماحول میں رہ کر شارع اسلام نے اس کے حق کو قائم کیا ہے۔ اس کی مثال مشکل ہی سے کسی دوسری قوم کی تاریخ میں مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں "از مہد تا لحد" عورت کی زندگی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں، ان سب کو پیش کیا گیا ہے اور اس التزام کے ساتھ کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف قرآن اور اس کی تائید میں احادیث معتبر کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے تاکہ اسے کوئی شخص محض روایتی چیز یا تاریخی تحریف نہ کہہ سکے۔

اس کے فاضل مصنف نے جس تردد و کاوش سے کام لے کر یہ کتاب مرتب کی ہے، اس کا اندازہ آسان نہیں، کیونکہ انھوں نے اس کی تصنیف میں دوسروں کی تصانیف پر اعتماد نہیں کیا بلکہ براہ راست قرآن کو سامنے رکھ کر وہ تمام احکام یک جا کر دیے ہیں جو اس موضوع سے تعلق رکھتے تھے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ عورت کی اصلاح اور اس کے حقوق کے بقا و تحفظ کے نقطۂ نظر سے تعلیمات اسلام کا کیا مرتبہ ہے اور فاضل مصنف نے کس محنت و کاوش سے تمام مضامین کا استنباط قرآن سے کیا ہے۔

اس سلسلہ میں اسلام پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے غلامی کے رواج کو قائم رکھ کر عورتوں کو لونڈی بنے رہنے کی لعنت سے آزاد نہیں کرایا۔ یہ اعتراض اس لحاظ سے تو درست ہے کہ اسلام لونڈی اور آزاد عورت کے فرق کو بالکل نہیں مٹا سکا، لیکن یہ سمجھنا کہ اسلام نے اس لعنت کے دور کرنے کی کوشش نہیں کی بالکل غلط ہے۔

دنیا میں کوئی سماجی اصلاح دفعتاً نہیں ہو سکتی، اس کے لئے کافی زمانہ درکار ہوتا ہے خاصکر کسی ایسے رسم و رواج کو مٹانا جو صدیوں سے چلا آ رہا ہو بہت مشکل ہوتا ہے۔

عربوں میں رواج غلامی کی بھی یہی صورت تھی کہ لوگ اس کے حد درجہ عادی ہو چکے تھے اور دفعتاً اس کا مٹانا آسان نہ تھا، اسلام نے ایسے مخالف و نامناسب ماحول میں بھی اس مذموم رواج کے دور کرنے کے لئے جو قدم اٹھایا اس کا علم آپ کو اس کتاب سے بھی ہو سکتا ہے۔

فاضل مصنف نے آیات قرآنی سے جو کچھ استنباط و استنتاج کیا ہے، ممکن ہے اس کے بعض کو کچھ اختلاف ہو، لیکن ایک "صحت مند" لٹریچر کا ثبوت یہی ہے کہ مصنف اپنی ذاتی رائے میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرے اور میں اس بات پر مالک رام صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ اپنے ضمیر یا وجدان کی روشنی میں لکھا ہے اور ایک تاریخی یا تحقیقی کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک پختہ و مستحکم رائے کا نتیجہ ہے۔

نیاز فتحپوری

عرض مؤلف

میں نے یہ مضمون اول بار اب سے دس بارہ سال پہلے لکھا تھا۔ لیکن چونکہ اس دوران میں، بیشتر ہندوستان سے باہر رہا، اس لیئے اس کی اشاعت کا جلد انتظام نہ کر سکا۔ میں نے اُسی زمانے میں اس کا مسودہ اظہار رائے کے لیئے، ہندوستان کے دو مختلف بلکہ یوں کہیئے متضاد خیال کے عالموں کی خدمت میں بھیجا تھا۔ دونوں اصحاب نے اسے پسند کیا۔ اگرچہ ایک صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے تمھاری بعض آراء سے اختلاف ہے۔ بہر حال چونکہ مجھے اس کے چھاپنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں تھی، اس لیئے معاملہ اسی پر ختم ہو گیا۔ اس اثناء میں مزید مطالعے اور غور و فکر سے خود میں نے بھی ایک آدھ جگہ تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اور آخر جو کچھ میری سمجھ میں آیا، وہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس مرتبہ مضمون تقریباً پورے کا پورا از سر نو لکھا گیا ہے۔

مجھے قرآن کریم کے مطالعے کا شوق کیسے پیدا ہوا اور کون سے اسباب اس شوق کی ترقی میں ممد و معاون ہوئے اس، سے بتانے کا یہ کوئی مناسب محل نہیں۔ اگر خدا نے چاہا اور زمانے نے فرصت دی، تو کسی دن یہ داستان بھی پیش کروں گا۔ یہاں اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک مُدّت سے قرآن اور اس کے متعلقات کا مطالعہ میرا عزیز ترین مشغلہ رہا اور میں نے اپنی بساط بھر قرآن اور اس کے مطالب کو خود سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

مجھے اس بات کا دعویٰ نہیں کہ میں نے اس موضوع پر کوئی نئی بات دریافت کی ہے۔ لیکن غالباً یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ عورتوں سے متعلق اسلامی تعلیم اتنی جامعیت سے اردو میں پہلی بار، ایک جگہ پیش کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کریں گے، میں نے تمام مسائل خود قرآن سے اَخذ کیئے ہیں اور حدیث صرف اس کی تائید اور توضیح کے لیئے لائی گئی ہے۔ کتب حدیث میں صحاح ستہ اور ان میں بھی بخاری

اور مسلم کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا ہے۔
ہو سکتا ہے کہ کہیں کہیں قرآن کو جیسا میں نے سمجھا ہے، وہ آپ کے نقطۂ نظر سے مختلف ہو یا اس سے جو نتیجہ میں نے نکالا ہے وہ آپ کے خیال میں غلط ہو۔ لیکن اس کے لیئے مجھے کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اگر میں نے عربی زبان کے حدود میں رہتے ہوئے، ایک رائے قائم کی ہے، تو تعبیر و تفسیر کا یہ اختلاف جائز ہے۔ عبارا تُنَا شَتّٰی وحُسنُکَ واحِدٌ۔ (تیرا حسن ایک ہی ہے، مگر ہم نے اپنی اپنی سمجھ اور ذوق کے مطابق اس کی کتنی تعبیریں کر لی ہیں)۔ ہاں اگر کہیں میں نے معنی ہی غلط سمجھے ہیں اور اس لیئے ان سے جو استدلال کیا ہے وہ بھی غلط ہے، تو باور فرمائیے کہ یہ سہو غیر ارادی طور پر ہوا ہے اور معلوم ہونے پر میں ایسی صورت میں اصلاح کرنے کو تیار ہوں۔ وما توفیقی الّا باللہ۔
"متمتع ز ہر گوشۂ یافتم" کے مصداق میں نے اس مضمون کی تیاری میں ماضی اور حال کے کتنے مصنفوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض کے نام آپ مختلف مقامات پر اس مضمون میں بھی پائیں گے۔ ان کے علاوہ اور بھی ہیں جن کے علم و فضل کی خوشہ چینی میں نے کی ہے۔ میں ان سب کا ممنونِ احسان ہوں۔ ان سب کے نام لکھنا غیر ضروری ہے اور طوالت کا باعث بھی۔ لیکن ایک نام ایسا ہے، جسے میں نظرانداز نہیں کر سکتا۔ یہ مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہٗ کی ذات گرامی ہے۔ جب میں نے یہ مضمون پہلی بار لکھا ہے، تو اس سے تھوڑے ہی دن پہلے "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی اور ان ایام میں متواتر میرے مطالعے میں رہی تھی۔ میں نے اس کے مطالب سے بہت فائدہ اٹھایا اور جہاں کہیں اس مضمون میں قرآن کے پہلے آٹھ نو پاروں کی آیات کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے، وہ بھی بہت حد تک ترجمان القرآن ہی کے الفاظ میں ہے۔
آخر میں دعا ہے کہ خدا ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔

مالک رام

پہلا باب

بیٹی

جاہلیت میں عورت اسلام سے پہلے عرب میں عورت کا مقام ٹھیک طور پر متعیّن کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ یہاں ہم عجیب متضاد قسم کے واقعات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو ایام العرب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت خاندان اور قبیلے میں کافی اثر رکھتی تھی قبیلوں کے درمیان جنگ کی حالت میں، اس کی رائے اور مشورے کو مناسب اہمیّت دی جاتی تھی اور خیمے کے اندر تو وہ پورے طور پر حاکمانہ اقتدار کی مالک تھی۔ اور دوسری طرف یہ حالت تھی کہ بسا اوقات لڑکی کی پیدائش کو باعثِ ننگ اور موجبِ عار خیال کیا جاتا تھا۔

ان کے یہاں لڑکی کا کوئی درجہ ہی نہیں تھا اور وہ ہمیشہ چاہتے تھے کہ لڑکا پیدا ہو۔ قرآن کریم نے ان کی اسی عادت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ [۱]

یَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ وَ لَهُمْ مَّا یَشْتَهُوْنَ (النحل ۱۶ - ۵۷) یعنی

حاشیہ [۱] اس تمام مضمون میں قرآن کے حوالوں کی صورت یہ ہے کہ سُورت کا نام، اس کا مقام اور آیت کا نمبر، یہ تینوں دیئے گئے ہیں۔ مثلاً (النحل ۱۶ - ۵۷) سے یہ مراد ہے کہ یہ آیت، سورت نحل کی ہے، جو قرآن کی سولھویں سورت ہے اور یہ آیت اس سورت کی ۵۷ ویں آیت ہے۔ ہندوستانی چھاپے کے قرآن میں بالعموم آیتوں کے نمبر نہیں ہوتے۔ آپ مصری چھاپے کا قرآن اُٹھا لیجئے، آپ کو حوالہ نکالنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔

"وہ کہتے ہیں کہ فرشتے خداوند تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں (جو ان کی نظر میں حقیر ہیں) حالانکہ وہ ان کمزوریوں سے پاک ہے (اُسے اولاد کی ضرورت ہی نہیں) اور اپنے لئے وہ بیٹے مانگتے ہیں (جو اُن کے نزدیک قابلِ فخر چیز ہیں)

اس کے متعدد اسباب تھے۔

جاہلیت میں عرب کے مختلف قبیلوں میں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اس لیے انھیں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ مردوں کی ضرورت تھی۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کو عورتوں پر ترجیح دی جانے لگی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ عورت کو ورثے اور مالِ غنیمت میں سے حصہ بھی نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن سے لڑ نہیں سکتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ لڑائی میں حصہ لینے والوں کی یہ عام خواہش ہوتی تھی کہ فریقِ مخالف کی عورتوں کو قیدی بنا لیا جائے تاکہ اُن کے بدلے میں زرِ فدیہ وصول ہو سکے جو عام طور پر اونٹوں یا بھیڑ بکریوں کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا۔ اگر ان عورتوں کے وارث یہ زرِ فدیہ ادا نہ کر سکتے، تو اس صورت میں یہ عورتیں اپنے پکڑنے والوں کے گھروں میں لونڈیاں بنا لی جاتی تھیں۔ غرض کہ دونوں صورتوں میں عورت والے نقصان میں رہتے اگر زرِ فدیہ دیا تو مال کا نقصان اور اگر نہ دیا تو ناموس اور عزت کا نقصان

پھر یہ خیال بھی تھا کہ اگر وہ زندہ رہ گئی تو اسے بہر حال کسی دوسرے کے عقدِ نکاح میں دینا پڑے گا اور یہ بھی ان کے خیال میں سخت باعث شرم تھا اسی طرح ہندوستان کے عہدِ وسطےٰ کے راجپوتوں کے دل میں یہ جھوٹا خیال بیٹھا ہوا تھا کہ ہم کسی اور کو بیٹی دے کر سسر کہلائیں! اس سے تو مر جانا بہتر ہے۔ وہ سسر کہلانے کو گالی سے کم نہیں سمجھتے تھے اُنھوں نے اس موہوم ذلّت سے بچنے کا یہ علاج سوچا تھا کہ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دیتے تھے۔ ایّامِ جاہلیت میں امراء اور عمائد

بھی کسی کا سسر کہلانے کو ذلت خیال کرتے تھے

دختر کُشی ان سب باتوں نے مل کر جاہلیت کے عربوں میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ لڑکی کو زندہ رکھنے میں سراسر نقصان ہی نقصان ہے۔ اس کی پرورش اور غور و پرداخت پر خرچ اور محنت اُتنی ہی کرنا پڑے گی، جتنی ایک لڑکے کے لئے ضروری ہے، مگر دشمن کا مقابلہ کرنے میں وہ لڑکے کے برابر مفید نہیں اور اگر کہیں وہ لڑائی میں قید ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں اس کا آسان علاج اُنھوں نے یہ سوچا کہ پیدا ہوتے ہی اُسے مار ڈالتے اور عموماً اس کی یہ شکل ہوتی کہ گڑھا کھود کر اُسے زندہ دفن کر دیتے۔ قرآن کریم اسی کے متعلق کہتا ہے:-

إِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝

(النحل ۱۶ = ۵۸ - ۵۹)

جب ان میں سے کسی کو لڑکی (کی پیدائش) کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصے میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ اُسے بہت بری خبر خیال کرتا ہے اور اس کی وجہ سے دوسروں کے سامنے آنے سے شرم کرتا ہے (اور سوچتا ہے) کیا میں اسے ذلت کے لئے زندہ رہنے دوں یا زمین میں گاڑ دوں۔ یاد رکھو وہ جو فیصلہ بھی کرتے ہیں وہ بہت برا ہے۔

الغرض وہ لڑکی کو دوسرے کے عقدِ نکاح میں دینا باعثِ ننگ خیال کرتے تھے۔ اس ذلت سے بچنے کے لئے اُنھوں نے لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی رسم نکالی۔ چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (التکویر ۸۱-۸) اور جب زندہ درگور سے سوال کیا جائے گا۔ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (۹)، تجھے کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا۔ ہوتا یہ تھا کہ جوں ہی لڑکی پانچ چھ برس کی ہو جاتی، یہ لوگ اسے گڑھا کھود کر اس میں ڈھکیل دیتے یا پہاڑ کی چوٹی سے گرا دیتے۔

جاہلیت کی روایتوں اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم بد بنی اسد کے اُمراء سے شروع ہوئی اور ان کی نقل میں بنو ربیعہ اور کندہ اور بنو تمیم کے بڑے لوگوں نے بھی اسے اختیار کر لیا۔ مگر بدقسمتی سے یہ امیروں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ ان کی دیکھا دیکھی نچلے طبقے میں کے لوگوں میں بھی راہ پا گئی۔ قرآن اسی طرف اشارہ کرتا ہے

زَیَّنَ لِکَثِیْرٍ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ قَتْلَ اَوْلَادِھِمْ شُرَکَآؤُھُمْ لِیُرْدُوْھُمْ۔ (الانعام ۶-۱۳۷)	مشرکوں میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ ان کے شریکوں (کی تعلیم اور مثال) نے (ان کی نظر میں) قتلِ اولاد (جیسے بدفعل) کو اچھا بنا رکھا ہے۔ تاکہ (اس طرح) انھیں ہلاک کر ڈالیں۔

یہ شرکا ان کے امراء اور کاہن تھے، جو ایک اپنی تعلیم سے اور دوسرے اپنے عمل سے اُنھیں بھی اسی راہِ ہلاکت کی طرف لے گئے جس پر وہ خود چل رہے تھے۔ کاہنوں اور دینی بزرگوں نے کہہ رکھا تھا کہ لڑکیوں کو زندہ نہ رکھو کیونکہ یہ ذلّت کا سبب ہیں۔ امیروں اور دنیوی سرداروں نے خود اس پر عمل کر کے اس فعلِ قبیح کی عمدگی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ زَیَّنَ کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ غریب لوگ دل سے اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن دینی اور دنیوی لحاظ سے اپنے سے بہتر لوگوں کو ایسا کرتے دیکھ کر ان کی نظروں

میں بھی یہ فعل اچھا ہوگیا اور وہ بھی ان کی تقلید میں اپنی اولاد کو قتل کرنے لگے۔ ع۵

قتل اولاد کی دوسری وجہ ان کی مفلسی تھی۔
جزیرۃ العرب جیسا آج ہے ویسا ہی جب بھی تھا۔ سامانِ خوراک کے مُہیا کرنے کے لیئے ان لوگوں کو جیسی کچھ محنت کرنا پڑتی ہوگی اس کا اندازہ ہم موجودہ حالات سے کرسکتے ہیں۔ ان لوگوں نے سُوچا کہ لڑکی، لڑکے سے کم تو کھلائے گی نہیں اور یقیناً لڑکے کے مقابلے میں اس کا فائدہ بہت کم ہے۔ پس اُسے زندہ رکھنے سے حاصل۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ والدین واقعی غریب ہیں اور وہ بچوں کی پرورش کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں اور اس لیئے اُنھیں قتل کردیتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اگرچہ مفلس نہیں لیکن اُنھیں اندیشہ ہے کہ ہم یوں اپنا مال بیٹیوں کی پرورش پر فضول خرچ کرکے مفلس ہوجائیں گے۔ قرآن نے ان دونوں صورتوں کا الگ الگ ذکر لیا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ — افلاس کے باعث اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔
(الانعام ۶ : ۱۵۱)

اور دوسری جگہ کہا:۔

لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ — اور افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو

حاشیہ ع۵ قتل اولاد کی ایک دوسری شکل بھی ان میں رائج تھی۔ جب کسی کے ہاں بیٹوں کی تعداد دس تک پہنچ جاتی تو ایک کو بتوں کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت رسول کریم صلعم کے والد عبداللہ کو ان کے والد عبدالمطلب نے بُت پر چڑھانے کی منت مانی تھی اور بعد میں ان کی جگہ سَو اونٹ ذبح کرکے اُنھیں بچالیا۔ جاہلیت میں مرد قیدی کا فدیہ ایک سَو اونٹ غالباً یہیں سے مقرر ہوا۔ حضرت رسولِ کریمؐ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ انا ابن الذبیحین میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں یعنی اوّل حضرت اسمٰعیلؑ کا جنھیں ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے حکم سے ذبح کرنے کا قصد کیا تھا اور دوم عبداللہ کا۔ قرآن نے جہاں قتلِ اولاد سے منع کیا ہے اس میں اولاد کو بتوں کی نذر کرنا بھی شامل ہے۔ یہ بھی قتلِ اولاد سے کم نہیں۔

اِمْلَاقٍ (بنی اسرائیل ۱۷ = ۳۱) قتل نہ کرو۔

اسلام نے سب سے پہلے تو اس رسم بد کا قلع قمع کیا اور کہا۔ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۷ = ۳۱) کہ اولاد کو قتل کرنا نہایت برا فعل ہے۔ ہزار کاہنوں اور لاکھ امیروں کی تعلیم اور عمل اُسے اچھا نہیں بنا دے سکتے۔ یہ دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے ہلاکت کا راستہ ہے، اس سے اجتناب کرو۔ رہا دوسری صورت میں افلاس کا خوف تو فرمایا:۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (الانعام ۶ = ۱۵۲) — ہم ہی تمھیں رزق دیتے ہیں اور اُن کو بھی دیں گے۔

نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (بنی اسرائیل ۱۷ = ۳۱) — ہم ہی انھیں رزق دینے والے ہیں اور تم کو بھی۔

اس لیئے تم افلاس کے ڈر سے، رحمتِ خداوندی سے مایوس نہ ہوا اور قتلِ اولاد کا گناہ نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق نہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ ہم جس لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دے رہے ہیں، وہی بڑا ہو کر بُرا نکلے اور لڑکی، جسے آج اپنے لیئے ذلت کا موجب سمجھتے ہیں، وہی عزت کا باعث ثابت ہو اور دین کی زیادہ خدمت کر سکے۔ حضرت مریم صدیقہ کی والدہ نے بھی اپنے یہاں لڑکی پیدائش پر اظہار افسوس کیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ لڑکا پیدا ہوتا، جو ساری عمر دین کی خدمت کرتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى (آل عمران ۳ = ۳۶) — اللہ اس لڑکی سے متعلق جو اس نے جنی ہے بہتر جانتا ہے (کہ وہ آگے چل کر کیا بننے والی ہے، حالانکہ اس کی ماں کا یہی خیال ہے کہ) لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا (بلکہ اس سے بہتر ہوتا ہے)

اس کے علاوہ چونکہ عورت نسل انسانی کی بقا کے لیئے ضروری ہے اس لیئے ارشاد ہوتا ہے :۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ

(الشوریٰ ۴۲ = ۴۹)

اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے (اولاد میں) لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے (تم اُن کے غم و غصہ کا اظہار یا اعتراض کرنے والے کون ہو)

یعنی لڑکی اور لڑکا دونوں اللہ تعالیٰ کے پیدا کیئے ہوئے ہیں، پس ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہاں لڑکیوں کو پہلا درجہ دیا اور ان کا ذکر لڑکوں سے پہلے کیا، تاکہ عورت کی اہمیت واضح ہو۔ دوسری جگہ لڑکے اور لڑکی کے مساوی درجے کا ذکر اس طرح کیا۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

(النساء ۴ = ۱)

خدا نے تم سب عورتوں اور مردوں کو ایک نفس سے پیدا کیا۔

پس جب دونوں ایک ماں باپ کی اولاد ہیں تو عورتوں سے سلوک میں کسی طرح کا امتیاز روا رکھنا معقول نہیں۔ لیکن یہ خیال بھی بہر حال غلط ہے کہ دُختر کشی کا عام رواج تھا کیونکہ اس صورت میں اُن کی نسل آگے کیسے چل سکتی تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ لڑکی کی پیدائش کو برا خیال کرتے تھے لیکن قتل کی حد تک ان میں سے کم ہی جاتے تھے۔ غرض اسلام نے بیٹیوں کے قتل اور زندہ دفن کرنے کو حرام قرار دے دیا (متفق علیہ) اسی لیئے جب رسول کریمؐ عورتوں سے بیعت لیتے تھے تو قرآن کی ہدایت کے مطابق دوسری شرائط کے ساتھ ایک

شرطیہ بھی کی جاتی تھی کہ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ (الممتحنہ ۶۰ : ۱۲) کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔

تعلیم و تربیت

جب یہ تعلیم دی کہ لڑکی اور لڑکا دونوں تمھاری اولاد ہیں اور تمھیں ان سے یکساں سلوک کرنا چاہیئے تو ظاہر ہے کہ ان کی تربیت میں بھی کسی طرح کا امتیاز جائز نہیں اور یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ کوئی شخص عام حالات میں لڑکی کو لڑکے سے کم درجہ دے کر، اسکی تعلیم و تربیت نظر انداز کردے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے:۔

الرّجل تكون له الامة	اگر کسی شخص کے پاس ایک لونڈی ہو۔
فيعلّمها فيحسن تعليمها ويؤدبها	پھر وہ اُسے تعلیم دے اور اچھی تعلیم۔
فيحسن ادبها ثم يعتقها	اور اُس کو آداب مجلس سکھائے اور
فيتزوجها فله اجران۔	اچھے آداب پھر آزاد کرکے اُس سے نکاح
(بخاری۔ کتاب العلم)	کرلے تو اس شخص کے لیئے دوہرا اجر ہے۔

یعنی ایک اجر تو اس بات کا کہ اس نے اسے تعلیم دی اور آداب سکھائے اور دوسرا اجر اس امر کا کہ اسے آزاد کرکے اس سے نکاح کرلیا اور اس طرح اس کا درجہ بلند کیا۔

پھر ظاہر ہے کہ اسلام جو لونڈیوں تک کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کو کارِ ثواب قرار دیتا ہے وہ آزاد لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم سے محروم رکھنا کیونکر گوارا کرسکتا ہے۔ رسول کریم صلعم نے تعلیم کی عظمت ظاہر کرنے کے لیئے ارشاد فرمایا کہ اس کا حاصل کرنا ہر ایک مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ طلبُ العلم فریضۃٌ علیٰ کل مسلمٍ و مسلمۃٍ (ابن ماجہ) پھر فرمایا:۔ اطلبوا العلم ولو كان فی الصین۔ اگر تمھیں علم چین تک کا سفر کرکے ہی حاصل ہو سکتا ہے تو

اسے وہاں سے بھی حاصل کرو۔ ایک دوسرے موقع پر حصول علم میں ہر طرح کے امتیاز اور تنگ نظری کو مٹانے کی خاطر نہایت لطیف پیرائے میں فرمایا: کلمة الحکمة ضالة المومن فحیث وجدھا فھو احق بھا (ترمذی۔ ابن ماجہ) علم مومن کا گم شدہ مال ہے۔ پس جہاں بھی اُسے پائے، اُسے حاصل کرنے کا وہ زیادہ حق دار ہے۔

قرآن نے ہر جگہ اعمالِ صالحہ کے اجر میں عورت کو مرد کے برابر درجہ دیا ہے۔ اس لیئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کو لڑکوں کی تعلیم سے کم اہمیت دیتا۔

بقائے جسمانی سے بقائے روحانی زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اگر قرآن نے لڑکیوں کے قتل کی اس قدر مذمت کی اور عربوں کو اس برے کام کے ارتکاب سے روکا تو وہ ان کے بقائے روحانی کو کیسے نظر انداز کر دے سکتا تھا۔ بلکہ اس کی نظر میں تو یہ بھی قتل کے مترادف ہے۔ فرماتا ہے:-

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (الانعام ۶ = ۱۴۰)	یقیناً وہ لوگ سخت نقصان اُٹھانے والے ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو اپنی حماقت سے جاہل اور بے علم رہ کر ہلاک کیا۔

قرآن کہتا ہے کہ ہم نے عورت کو اس لیئے پیدا کیا کہ وہ مرد کے لیئے تسکین کی باعث ہو۔ لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا (الروم ۳۰ = ۲۱) وہ تسکین جسمانی بھی ہو سکتی ہے اور ذہنی اور روحانی بھی۔ اگر کسی پڑھے لکھے شخص کے نکاح میں کوئی پھوھڑ اور ان پڑھ بیوی دے دی جائے، تو اس سے کیا ذہنی تسکین حاصل ہو سکتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ جسمانی تسکین بھی ذہنی اور روحانی تسکین سے وابستہ ہے۔ اگر انسان کو ذہنی پریشانی اور روحانی اذیت ہو تو کوئی چیز اس کے دل کو نہیں بھا سکتی۔

قرآن نے جہاں ان یتامیٰ کی تربیت کا ذکر کیا ہے جو دوسروں کی ولایت میں ہیں، وہیں یہ تاکید بھی کی ہے کہ:۔

وَارْزُقُوهُمْ وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا۔ (النساء ۴ ، ۵)	تم اُنھیں ان کے مال سے (اچھا کھانے کو دو۔ (اچھا) پہننے کو دو اور اُنھیں نیک اور اچھی باتیں سکھاؤ۔

ایسی تعلیم دینا جو اولاد میں شرک اور توہمات کے خیالات پیدا کر دے اور جس سے اُن کے اعمال تباہ ہو جائیں یہ بھی ان کے قتل سے کم نہیں۔ محض تعلیم پر مدار نہیں بلکہ اچھی اور نیک تعلیم ہو" فیعلمہا فیحسن تعلیمہا" پس اُنھیں تعلیم دو اور عمدہ تعلیم جو اُنھیں نیک اور خدائے واحد کا پرستار اور دین و دنیا میں ترقی کرنے والا بنائے۔ قرآن فرماتا ہے:۔

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (تحریم ۶۶ : ۶)	اے مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

اس لیئے اگر کوئی شخص اپنی اولاد کو ایسی تعلیم دیتا ہے جو اُسے شرک اور گناہ اور فسق و فجور کی طرف لے جاتی ہے تو وہ گویا اس حکم کی تعمیل نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اُنھیں آگ کی طرف ڈھکیل رہا ہے۔

اندرون خانہ زندگی عام تجربہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں تھوڑا علم حاصل کر کے پندار و عجب کا شکار ہو جاتے ہیں اور نمائش ان کا شیوہ ہو جاتا ہے۔ یہ یقیناً نامناسب ہے اور قرآن اس کا سخت مخالف ہے۔ چنانچہ اس کا حکم ہے کہ جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچے تو اپنی آرائش اور خوبصورتی کو نمایاں نہ کرے شرم و حیا کو ملحوظ رکھے۔ باہر نکلے تو بھی احتیاط سے اور چال ایسی چلے جس سے حیا ٹپکے۔ اس باب میں پہلے مردوں کو حکم دیا۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ

(اے نبی!) مومنوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزگی کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے تمام افعال سے واقف ہے۔

(النور ۲۴=۳۰)

فرج کے لغوی معنی میں تمام ایسے اعضا، شامل ہیں جو گناہ کی ترغیب میں معاون ہو سکتے ہیں مثلاً آنکھ، کان، منہ، پاؤں اور اس لئے اس حکم کی روح یہ قرار پاتی ہے کہ نہ بُری نظر سے کسی کو دیکھو، نہ گندہ اور فحش کلام سنو اور نہ خود کہو اور نہ پاؤں سے چل کر ایسے مقام پر جاؤ جہاں گناہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کے بعد عورتوں کو حکم ہوتا ہے:

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔

اور (اے نبی!) مومنہ عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت و آرائش کی نمائش نہ کریں سوائے اس کے جو (ضرورت سے یا مجبوری سے) کھل جائے۔

(النور ۲۴=۳۱)

زینت دو قسم کی ہے، ایک قدرتی، دوسری مصنوعی۔ قدرتی میں خد و خال کا حسن، جسم کی بناوٹ، قد و قامت کی موزونی وغیرہ شامل ہیں مصنوعی سے۔ بالوں کی آرائشگی، سرمہ، مسّی، زیور، لباس وغیرہ مراد ہیں۔ اور یہ دونوں اپنے اپنے موقع پر کشش اور شہوانی ہیجان کا باعث ہو سکتی ہیں۔ قرآن کا حکم یہ ہے کہ عورت اپنی ہر طرح کی زینت چھپائے اور اُسے دانستہ نمائش کی غرض

سے ظاہر نہ کرے۔ ہاں جو حصہ ضرورت سے یا مجبوری سے ظاہر کرنا پڑے
اس میں مضائقہ نہیں (اِلَّا مَا ظَہَرَ مِنۡہَا)

اس پر بہت بحث کی گئی ہے کہ اِلَّا مَا ظَہَرَ مِنۡہَا میں جسم کے کون کون سے
حصے شامل ہیں۔ قدماء کی اکثریت کی رائے میں اس میں عورت کا ہاتھ اور چہرہ
شامل ہیں۔ لیکن اس پر بحث تحصیل حاصل ہے۔ قرآن نے کوئی حد بندی نہیں
کی اور یہی اس کے حکیم ہونے کی دلیل ہے۔ اگر وہ جسم کے سب ایسے حصوں کو
گنا دیتا جن کو کھولا جا سکتا ہے تو عند الضرورت بھی ان اعضاء کے علاوہ اور حصۂ
جسم کو ظاہر کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ اس سے شریعت کی صریح خلاف ورزی لازم
آتی۔ پس اس نے ایک اصول بیان کر دیا کہ سب طرح کی آرائش چھپاؤ، لیکن
اگر کسی ضرورت اور مجبوری سے اس کے خلاف کرنا پڑے، تو اس میں گناہ نہیں
مثال کے طور پر قامت کو لیجئے۔ عورت کی بلند قامتی اس کا حُسن اور زینت
ہے۔ لیکن وہ لاکھ چاہے' اسے چھپا نہیں سکتی۔ یا مثلاً وہ بیمار پڑ جائے اور علاج
کے لئے اُسے اپنا جسم طبیب کو دکھانا پڑے، تو اس میں شریعت مانع نہیں۔ پس
دیکھنا یہ ہے کہ عورت اپنے آپ کو نمائش کے لئے ظاہر کر رہی ہے یا ضرورت
سے۔ اگر مقصود نمائش ہے تو ہاتھ اور چہرہ بھی ممنوعات کے حکم میں ہیں اور اگر
واقعی ضرورت ہے تو پورا جسم دکھا دینے میں کوئی حرج نہیں۔

یاد رہے کہ یہ احکام عورت کی گھر کے اندر کی زندگی سے متعلق ہیں یعنی
جب وہ گھر کی چار دیواری کے اندر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے
درمیان ہے تو اس کا طرزِ عمل اس ہدایت کے مطابق ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ عورتیں اپنی اوڑھنیوں کو اپنے سینے
پر ڈال لیا کریں:۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ۔ (النور ۲۴:۳۱)	اور وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینے پر ڈال لیں۔

عورت کے جسم کا یہ حصہ کتنا جاذبِ نظر ہے، اس کے متعلق زیادہ لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ مراد یہ ہے کہ یہ حصہ اس وقت تک پوشیدہ کیا ہی نہیں جا سکتا جب تک عورت کے سر پر دوپٹہ نہ ہو۔ اس سے گویا دو مقصد حاصل ہو گئے۔ وہ یہ کہ عورتیں اپنے سر و سینہ دونوں کو پوشیدہ رکھیں۔

لیکن اس سے یہ قباحت پیدا ہوتی، کہ اگر عورت اپنے گھر میں بھی ایسے تکلّف سے بیٹھتی، کہ اس کی زینت کے تمام مقام اور لباس کسی پر ظاہر نہ ہوں، تو اس سے گھر کا کام کاج کیسے چلتا۔ اس لیے ان رشتہ داروں اور عزیزوں اور دوسرے متعلقین کو مستثنیٰ کر دیا جو گھر گرستی میں عورت سے زیادہ ملتے جلتے ہیں۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ	اور عورتیں اپنی زینت کسی کے سامنے
اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ	ظاہر نہ کریں سوائے اپنے خاوندوں کے،
اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ	یا اپنے باپوں کے، یا اپنے خاوند کے باپوں
اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ	کے یا اپنے بیٹوں کے، یا اپنے خاوندوں
اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ	کے (دوسری بیویوں کے) بیٹوں کے، یا
اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ	اپنے بھائیوں کے، یا اپنے بھائیوں کے
نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ	بیٹوں کے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے، یا
اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ	اپنی عورتوں کے یا اُن کے، جن کے ان کے
اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ	دہنے ہاتھ مالک ہوئے ہیں۔ یا مردوں میں
الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ	سے ایسے خادموں کے جو نکاح کی خاص
لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى	ضرورت محسوس نہیں کرتے، یا اتنے کم عمر

عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۔ (النور ۲۴ = ۳۱)

بچوں کے جو ابھی تک عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے واقف نہیں ہوئے۔ اور اپنے پاؤں کو اس طرح زمین پر نہ ماریں جس سے جو کچھ وہ اپنی زینت میں سے چھپا رہی ہیں، ظاہر ہو جائے۔

اول وہ رشتہ دار ہیں جو اتنے قریبی ہیں کہ عورت کے محرمات میں شامل ہیں یعنی جن سے نکاح، شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ شوہر تو خیر ہے ہی، اس کے علاوہ باپ، سسر، بیٹا، سوتیلا بیٹا، بھائی بھتیجا، بھانجا، سب اسی حکم میں شامل ہیں۔ آبا، میں دادا، نانا، چچا، ماموں اور اوپر کے سب رشتے دار آجائیں گے۔ اَبٌ کا لفظ چچا کے لئے تو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ ۲ = ۱۳۳)

کیا تم اس وقت موجود تھے، جب یعقوب پر موت کی گھڑی وارد ہوئی اور اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا، میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے۔ انھوں نے کہا، ہم تیرے خدا اور تیرے آبا، ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کے خدا کی عبادت کریں گے جو خدائے واحد ہے ہم اسی خدا کے ماننے والے ہیں۔

یہاں حضرت اسمٰعیل کو بھی حضرت یعقوب کے آباء میں شامل کیا ہے حالانکہ وہ ان کے چچا تھے۔

حضرت رسول کریم صلعم فرماتے ہیں:۔ انا دعوۃ ابی ابراھیم
میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا کا نتیجہ ہوں۔ یہاں حضرت ابراہیم کو آب
کہا ہے، حالانکہ وہ ان سے بہت اوپر کی پیڑھی ہیں۔

اسی طرح ایک دفعہ اُم المومنین حضرت صفیہؓ بنت حیٔ نے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم سے شکایت کی کہ عائشہؓ اور زینبؓ مجھے چھیڑتی ہیں کہ ہم ازواج النبیؐ
میں سب سے افضل ہیں[ع] تو آپ نے فرمایا کہ تم نے کہا ہوتا۔ ان ابی ھارون
و عمّی موسیٰ و زوجی محمد۔ میرا باپ ہارون، میرے چچا موسیٰ اور میرے
خاوند محمدؐ ہیں، بھلا میں کس بات میں تم سے ہیٹی ہوں۔ یہاں بھی باپ اور چچا
کے الفاظ بہت آزادی سے بولے گئے ہیں۔

غرض کہ آبَ میں اوپر کے سب رشتے دار شامل ہیں۔

اس کے علاوہ یہ تمام رضاعی رشتے بھی شامل ہیں۔ جس طرح دوسری
جگہ جن عورتوں سے نکاح حرام ہے، ان میں بھی رضاعی رشتے شامل ہیں آ
آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ جو رشتے نسب کے ذریعے محرم ہوتے ہیں وہی
رضاعت سے بھی محرم ہو جاتے ہیں۔ (بخاری۔ کتاب النکاح)

آیت محولہ فوق میں ایک لفظ نسائھنّ (اپنی عورتوں) ہے۔ یہ محض
رشتہ دار عورتوں تک محدود نہیں بلکہ اس میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو
ان کی ملنے جلنے والی ہیں۔ بعض لوگوں اس سے صرف مسلمان عورتیں مراد
لی ہے۔ حالانکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ خود امہات المومنین کے پاس غیر مسلم
عورتیں آیا جایا کرتی تھیں۔ عذابِ قبر والی مشہور حدیث کا موقع ہی اس طرح

حاشیہ ع وجہ فضیلت یہ تھی کہ ہم قریش سے اور حضور علیہ السلام کے قبیلے اور خاندان سے ہیں
اور تم یہودیہ ہو

پیش آیا کہ دو یہودی عورتیں حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں اور اُنھوں نے باتوں باتوں میں آپ کو دعا دیتے ہوئے کہا کہ "خدا آپ کو عذاب قبر سے محفوظ رکھے"۔ آپ نے جواب دیا کہ عذابِ قبر کوئی چیز نہیں۔ لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی اور دل میں الجھن سی رہی۔ چنانچہ جب حضور علیہ السلام تشریف لائے تو اُن سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں عذاب قبر سچ ہے (بخاری۔ کتاب الجنائز) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلم عورتیں آپ کے گھروں میں آیا جایا کرتی تھیں

قرآن بھی غیر مسلم اور مشرکہ عورتوں سے ملنے کو نہ صرف یہ کہ منع نہیں کرتا بلکہ ان سے حسن سلوک سے پیش آنے کی تاکید کرتا ہے:۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ	اللہ تعالیٰ تمھیں اس سے منع نہیں کرتا
لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ	کہ جن لوگوں نے تمھارے دین کے
وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ	معاملے میں تم سے لڑائی نہیں کی اور
دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ	نہ تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا تم
وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ	اُن سے احسان کرو اور ان سے انصاف
يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ	سے پیش آؤ۔ اللہ تو انصاف کرنے والوں
(الممتحنہ ۶۰ ، ۸)	سے محبت کرتا ہے۔

اسی طرح مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ سے صرف لونڈیاں ہی نہیں بلکہ غلام بھی مراد ہیں۔ لونڈیوں سے متعلق تو خاص الگ حکم دینے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ نِسَآئِهِنَّ ہی میں شامل ہیں۔ در اصل غلاموں ہی کے لئے خاص صراحت چاہی تھی۔ گھریلو کام کاج کے لئے ادنیٰ خادم، سقہ خاکروب وغیرہ بھی اسی میں شامل ہیں۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ ایسے خادم بھی جنھیں شادی کی ضرورت نہ ہو۔

اَوِ التَّابِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ۔ جیساکہ ابن کثیرؒ نے لکھاہے اس سے مراد وہ مزدور اور ملازم اور خادم ہیں جو عورت سے کم درجے کے ہیں۔ نیز وہ سادہ اور شریف طبع مرد جو نہ عورتوں سے متعلق خیال کرتے ہیں نہ جنسی میلان رکھتے ہیں۔" ہو سکتا ہے کہ وہ کبیر السن ہونے کی وجہ سے ایسے ہوں یا کسی پیدائشی کمزوری کے سبب اس کے قابل نہ ہوں جیسے مخنث جو لوگ سماجی لحاظ سے ایسے کم درجے کے ہیں کہ خود عورت کے یا اس کے خاوند کے ماتحت اور دست نگر ہیں۔ اُن سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی وقت اس عورت سے متعلق کوئی قابل اعتراض خیال اپنے دل میں لائیں گے۔ اگرچہ ان آخری تین صورتوں میں یہ عام حکم ہے لیکن بہرحال گھر کے مردوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کی احتیاط رکھیں کہ جو غیر عورتیں ان کے گھر میں آرہی ہیں، ان کے اخلاق کیسے ہیں اور آیا وہ اس قابل ہیں کہ ان کے گھر کی عورتوں سے ملیں۔ اسی طرح کیا غلام اور تابعین ایسے ہیں کہ واقعی اِن پر اعتبار کیا جاسکتا ہے یا نہیں اور غیر اولی الاربہ ہیں بھی یا نہیں۔ اس میں محض ظاہری صورت یا عام شہرت پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ تحقیق کرلی جائے کہ وہ گھروں میں آنے جانے کے قابل ہیں۔ خود رسول کریم علیہ السلام کی زندگی کے ایک واقعے سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔

مدینہ میں ایک مخنث مرد تھا، جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں آیا جایا کرتا تھا، اور اس کی جسمانی حالت کے پیش نظر کوئی اسے گھروں کے اندر آنے جانے سے روکتا نہیں تھا۔ ایک دفعہ وہ حضرت اُمِّ سلمہؓ کے پاس بیٹھا، ان کے بھائی عبداللہؓ سے بات چیت

کر رہا تھا اور ان سے کہہ رہا تھا کہ اگر کل طائف فتح ہو گیا تو میں تمھیں غیلان ثقفی کی بیٹی بادیہ دکھلاؤں گا۔ (وہ اتنی خوبصورت ہے کہ) جب وہ سامنے سے آرہی ہو تو اس کے پیٹ کے چار بل دکھائی دیتے ہیں اور جب پلٹتی ہے تو آٹھ بل نظر آتے ہیں" اور اس کے بعد اُس نے چند عُریاں لفظوں میں اس کے ستر کی تعریف کی۔ اتفاق سے جس وقت وہ یہ باتیں کر رہا تھا حضورؐ باہر سے گھر میں داخل ہوئے۔ آپ نے اس کے یہ آخری لفظ سُن لیئے تھے۔ آپ بہت خفا ہوئے اور فرمایا لقد غلغلت النظر الیھا، یاعد واللّٰہ (اے دشمن خدا! اس کا یہ مطلب ہے کہ تو نے اس عورت کو نظر بھر کے دیکھا) پھر حکم دیا کہ چونکہ یہ شخص عورتوں کے معاملات سے واقف ہے، اس لیئے یہ آج سے ازواج مطہرات کے پاس نہ آنے پائے۔ بعد میں اسے مدینہ سے بھی باہر چلے جانے کا حکم دے دیا۔

آخر میں نابالغوں سے متعلق حکم دیا۔ نابالغوں اور خادموں کے لیئے دوسری جگہ مزید تفصیل سے فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ مناسب ہے
لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِينَ	کہ وہ لوگ جن کے تمھارے داہنے ہاتھ مالک
مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ	ہوئے ہیں اور (تم میں سے وہ لوگ) جو ابھی
وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ	تک سن بلوغ کو نہیں پہنچے ہیں وہ (تمھارے
مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ	گھروں میں آنے سے پہلے) تین بار اجازت
مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ	لے لیا کریں۔ نماز فجر سے پہلے اور دوپہر
وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ	کی گرمی کے وقت جب تم نے اپنے
مِنَ الظَّهِيرَةِ وَمِنْ بَعْدِ	کپڑے اتار رکھے ہوں اور عشاء کی نماز

صَلٰوۃِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(النور ۲۴ = ۵۸)

کے بعد یہ تینوں (اوقات) تمھارے خلوت کے ہیں۔ ان کے علاوہ نہ تم پر اور نہ اُن پر کوئی گناہ ہے۔ تم بلا تکلف ایک دوسرے کے پاس آجا سکتے ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام تمھیں وضاحت سے بتاتا ہے اور اللہ بہت جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

گویا دوسرے اوقات میں خُدام اور نابالغ لڑکوں کے آنے جانے پر ایسی پابندی نہیں اور نہ اُنھیں اندر آنے کے لیئے خاص اجازت لینے کی ضرورت ہے اور نہ اُن سے میاں بیوی کو خاص طور پر پردے ہی کی حاجت ہے۔

استیذان

سورۂ نور (۲۴) میں جن مردوں کا ذکر ہوا ہے، ان کے علاوہ اور سب مردوں سے عورت کو اپنی زینت اور آرائش چھپانا چاہیئے۔ اسی لیئے حکم دیا کہ اگر کوئی غیر محرم شخص کسی دوسرے کے گھر میں جائے تو اطلاع کرائے بغیر اندر نہ گھس جائے کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ گھر کی مستورات بے تکلف بیٹھی ہوں جیسا کہ گھروں اندر عموماً ہوتا ہے اس صورت میں، اس کے یوں بغیر اطلاع اندر جانے سے، اُنھیں پریشانی ہو گی۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے استیذان کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں اذن یعنی اجازت طلب کرنا۔ اس کے پہلے سب سے پہلے ایک عام حکم دیا:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو

لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ	اپنے گھروں کے سوائے دوسرے گھروں
بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا	میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک
وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا ذٰلِكُمْ	(اس امر کی) اجازت نہ لے لو اور اہل خانہ
خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ	پر سلام کہو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے کہ تم
تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ	ان باتوں سے نصیحت حاصل کرو۔ اور
تَجِدُوْا فِيْهَا اَحَدًا فَلَا	اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو اُن میں داخل نہ ہو
تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ	تاوقتیکہ تمھیں (ایسا کرنے کی) اجازت
لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ	دی جائے۔ اور اگر تم سے لوٹ جانے کو
ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى	کہا جائے تو لوٹ جاؤ۔ یہ تمھارے لیے
لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	زیادہ پاکیزگی کا موجب ہے اور جو کچھ تم
عَلِيْمٌ ۝ (النور ۲۴: ۲۷-۲۸)	کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی دستور تھا کہ وہ کسی کے ہاں جاتے تو دروازے پر اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ فرماتے تاکہ صاحب خانہ کو علم ہو جائے اور وہ آپ کو اندر آنے کی اجازت دے دے۔ اگر پہلی بار کوئی جواب نہ ملتا تو دوسری مرتبہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتے۔ اگر پھر کوئی جواب نہ ملتا تو تیسری مرتبہ پھر یہی کرتے اور اس کے بعد بھی جواب نہ ملنے پر واپس تشریف لے جاتے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ سعدؓ بن عبادہ کے گھر تشریف لے گئے۔ حسب معمول آپؐ نے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہا۔ سعد نے جواب میں آہستہ سے وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ کہا جو آپ نہ سُن سکے۔ اِسی طرح تینوں بار ہوا۔ آخر جب یہ خیال کر کے واپس جانے لگے کہ غالباً گھر پر کوئی نہیں تو حضرت سعدؓ دوڑ کر آئے اور آپ کو ساتھ لے گئے اور کہا حضور میں نے جواب تو دیا تھا لیکن آہستہ

سے، کیونکہ میں چاہتا تھا کہ آپ زیادہ سے زیادہ بار میرے لیئے دعا کریں
(السلام علیکم بھی سلامتی کی دعا ہے۔)

اگر سلام کے جواب میں صاحب خانہ، مکان کے اندر سے نام پوچھے تو فوراً اپنا نام بتانا چاہیئے (مسلم کتاب الآداب) جابر کہتے ہیں کہ میں حضور کے پاس گیا اور اندر آنے کی اجازت طلب کی تو آپؐ نے اندر سے پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا "میں ہوں" اس پر آپؐ نے ناگواری سے فرمایا "میں ہوں میں ہوں" اور باہر تشریف لے آئے گویا آپؐ نے محض "میں ہوں" جواب دینے کو ناپسند فرمایا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب اندر سے کوئی جواب نہیں ملتا تو متجسس طبیعتیں ضبط نہیں کر سکتیں اور اِدھر اُدھر سے جھانکنے لگتی ہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے اور اس خاموشی کا کیا سبب ہے۔ حضورؐ نے اس طرح کسی دوسرے کے گھر میں جھانکنے سے منع فرمایا ہے (متفق علیہ) کیونکہ اس سے اجازت طلب کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس طرح جھانکے اور صاحب خانہ اُسے سزا دینے کے لیئے اس کے کنکری پتھر مار دے جس سے جھانکنے والے کی آنکھ پھوٹ جائے یا اسے کوئی اور زخم پہنچ جائے تو صاحب مکان بری الذمہ ہے اور جھانکنے والے کو قصاص نہیں دیا جائے گا (متفق علیہ)

لیکن اس عام حکم استیذان کے بعد فرمایا کہ تم کسی گھر سے کوئی چیز طلب کرنا چاہو تو تمہارا فرض ہے کہ مِن وَّرَآءِ حِجَابٍ سوال کرو تاکہ ایک دوسرے کا سامنا نہ کرنا پڑے، جو دونوں کے لیئے اخلاقی لحاظ سے اچھا ہے۔

حکم ہوتا ہے:۔

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا — اور جب تم عورتوں سے کوئی چیز طلب

فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ ذَالِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ

(الاحزاب ۳۳ = ۵۳)

کرو تو اُن سے پردے کے باہر سے باہر سے مانگو۔ یہ تمھارے دلوں کے لیئے اور ان کے دلوں کے لیئے زیادہ پاکیزگی کا موجب ہے۔

جیسے کہ اوپر ذکر ہوا ہے، غرض یہ ہے کہ گھر میں عموماً آدمی تکلف سے نہیں بیٹھتا اور غیر محرم کے سامنے آنے میں جس تکلف کی ضرورت ہے اگر اس کے بغیر پردے کے پیچھے ہی سے کام نکل جائے تو کیا ضرورت ہے کہ عورت مرد کے سامنے آئے۔ چونکہ بلا ضرورت مرد اور عورت کے ایک دوسرے کے سامنے آنے جانے سے معاشرتی خرابیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لیئے فرمایا کہ جہاں آمنے سامنے ہوئے بغیر مطلب حل ہو سکتا ہے، وہاں بے شک پردے کی اوٹ سے کام کرلو۔ یہاں پیرایۂ بیان نہایت بلیغ اختیار کیا ہے۔ اِسے مرد اور عورت دونوں کے لیئے پاکیزگی کا موجب بتایا ہے۔ اس یہ بھی ثابت ہوا کہ عورت کو غیر محرم سے بات چیت کرنے کی ممانعت نہیں۔ دوسری جگہ اس سے متعلق عورتوں سے زیادہ وضاحت سے فرمادیا۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○

(الاحزاب ۳۳ = ۳۲)

(اور کسی دوسرے شخص سے) نزاکت اور ملائمت سے گفتگو نہ کرو (مبادا) کسی کے دل میں (پہلے سے کوئی) رذیل خیال ہو اور (تمھاری گفتگو سے اُسے کوئی اور خواہش یا) ہوس پیدا ہو جائے۔ ہاں جو بات کرو وہ شائستگی اور نیکی سے کرو

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ان محرم مردوں کے علاوہ جن کا ذکر سورۂ نور

(آیت ۳۱) میں ہوا ہے، عورت کے لئے کسی اور غیر مرد کی شکل تک دیکھنا بھی منع ہے، خواہ یہ کسی بُری نیت سے نہ بھی ہو۔ اُنھوں نے استدلال حضرت عبداللہ بن ام کلثوم رضؓ والی حدیث سے کیا ہے۔ ابن ام کلثوم نابینا تھے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں اور میمونہؓ (یا عائشہؓ) رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر تھیں کہ ابن ام کلثوم آئے۔ رسول اللہؐ نے ہم سے فرمایا کہ اس سے پردہ کر لو۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! وہ تو اندھے ہیں۔ نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں، نہ پہچان سکتے ہیں" آپ نے فرمایا" کیا تم دونوں بھی اندھی ہو کہ اُسے نہیں دیکھ سکتیں" (ترمذی۔ ابوداؤد)

اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کے لئے کسی غیر مرد کو دیکھنا خواہ وہ شہوت کی نظر سے نہ بھی ہو، منع ہے۔ اگر اس امر سے قطع نظر بھی کر لی جائے کہ یہ عملاً ناممکن ہے، تو بھی یہ استدلال اس متفق علیہ حدیث کے خلاف ہے جس میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ عید کے دن بعض حبشی مسجد میں نیزوں سے کرتب دکھا رہے تھے اور حضرت عائشہ نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر کھڑے ہو کر ان کے شانوں کے اوپر سے یہ سارا تماشا دیکھا۔ کیونکہ وہاں بھی تماشا دکھانے والے غیر محرم تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس خاص موقع پر ابن اُم کلثوم کے لباس یا وضع قطع میں کوئی خاص چیز قابل اعتراض ہو گی، جس کا دیکھنا امہات المومنین کے لئے مناسب نہ رہا ہو گا اور اسی لئے آپ نے فرمایا کہ "مانا وہ نابینا ہیں، لیکن کیا تم نہیں دیکھ رہی ہو کہ وہ کس حال میں ہیں، پس اس کی طرف نہ دیکھو اور اگر یہ توجیہ درست نہ ہو تو پھر اس پر بخاری اور مسلم کی مندرجہ صدر متفق علیہ حدیث کو ترجیح دی جائے گی۔

بیرونِ خانہ زندگی اور پردہ

اسلام عورتوں کو ضرورت سے گھر سے باہر جانے کو منع نہیں کرتا۔ خود عہدِ نبوی میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جب عورتوں نے جنگ میں حصہ لیا ہے۔ وہ سپاہیوں کو پانی پلاتی اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں (مسلم۔ کتاب الامارۃ) بعض اوقات مجروحوں اور مقتولوں کی لاش واپس مدینے میں لانے کا کام ان کے ذمّے ہوتا تھا (بخاری۔ کتاب الجہاد) عورتیں گھر سے باہر کے کام کاج میں بھی اپنے مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک عورتوں کو آزادی سے باہر آنے جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ لیکن جہاں اسلام نے ضرورت باہر آنے سے منع نہیں کیا، وہیں باہر جانے کے چند آداب بھی مقرر کر دیئے ہیں۔

اوّل عام حالات میں عورت کو چاہیئے کہ اپنا منہ ڈھک کر چلے۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ	اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور
وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ	مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ
يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ	(باہر نکلتے وقت) اپنی چادر اپنے اوپر
أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؀	ڈال لیا کریں۔ یہ بہتر ہے کہ لوگ انھیں
(الاحزاب ۳۳ = ۵۹)	پہچان لیں تاکہ کوئی انھیں ایذا نہ دے سکے۔

جلباب وہ چادر ہے جو عورتیں اپنے سارے لباس کے اوپر اوڑھتی ہیں اور خمار یعنی اوڑھنی سے بڑی ہوتی ہے جو صرف سر پر اوڑھنے کے کام آتی ہے۔ حکم دیا۔ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ۔ یہاں مِنْ تبعیض کا ہے جیسے بیضاوی نے بھی لکھا ہے یعنی "وہ چادر کا کچھ حصہ اپنے منہ پر ڈال لیں یا لٹکا لیں"۔ مراد یہ ہے کہ جب عورت گھر سے سے نکلے گی

تو ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم و لباس کی آرائش چھپانے کے لیۓ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ایک بڑی سی چادر اوڑھے۔ لیکن یہاں مزید ہدایت یہ کی کہ وہ اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر ڈال لے۔ جس سے صاف مراد یہ ہے کہ وہ اپنا چہرہ پوشیدہ کرے۔ یہی پردہ ہے۔

متعدد حدیثوں سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ خود صدرِ اسلام میں اس سے یہی مراد لیا گیا کہ منہ چھپایا جائے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول کریم صلعم نے ام المومنین صفیہؓ بنت حیی سے غزوۂ خیبر میں نکاح کیا۔ وہ قیدیوں میں آئی تھیں۔ حضور نے انھیں آزاد کر کے انھیں زوجیت کا شرف بخشا۔ اگلی صبح دعوتِ ولیمہ میں صحابہ میں آپس میں گفتگو ہونے لگی کہ نہ معلوم آپؐ نے صفیہ سے نکاح کیا ہے یا اُن کو لونڈی بنایا ہے۔ اس پر ان میں سے کسی نے کہا کہ اگر حضورؐ نے صفیہؓ کو پردہ میں رکھا تو سمجھ لو کہ ان سے نکاح کیا ہے اور اگر پردہ نہ کرائیں تو وہ لونڈی ہیں۔ جب حضورؐ نے سوار ہونے کا ارادہ کیا تو صفیہؓ کے لیۓ پردہ کرایا اور وہ اونٹ کے پچھلے حصے پر بیٹھ گئیں۔ لوگوں نے جو یہ دیکھا تو انھیں معلوم ہو گیا کہ آپ نے ان سے نکاح کیا ہے۔ پھر جب لوگ مدینہ کے قریب پہنچے تو حضور تیزی سے روانہ ہوئے۔ آپؐ کی اونٹنی عضباء نے ایک مقام پر ٹھوکر کھائی۔ محمل کی رسّی ٹوٹ گئی اور آپؐ اور صفیہؓ دونوں اس سے نیچے گر پڑے آپؐ نے فوراً اٹھ کر صفیہؓ کو پردے میں لے لیا (مسلم۔ کتاب النکاح)۔

انسؓ ہی سے دوسری روایت بخاری (کتاب الجہاد) میں ہے کہ عسفان سے واپسی پر حضور علیہ السلام اونٹنی پر سوار تھے اور اس مرتبہ بھی

امّ المومنین صفیہؓ ہی آپؐ کے پیچھے سوار تھیں۔ سوء اتفاق سے اونٹنی کا پاؤں پھسل گیا اور دونوں گر پڑے۔ یہ دیکھ کر ابو طلحہ اپنے اونٹ سے کود پڑے اور دوڑ کر آپؐ کے پاس آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ، خدا مجھے آپ پر قربان کر دے " تو آپ نے فرمایا کہ پہلے عورت کی طرف توجہ کرو۔ تب ابو طلحہؓ اپنے منہ کو کپڑے سے ڈھانک کر حضرت صفیہؓ کے پاس گئے اور وہ کپڑا ان پر ڈال دیا اور ان کے لیئے سواری تیار کی اور پھر دونوں سوار ہوئے

حدیث افک میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں جب ہار تلاش کر کے قیام گاہ پر واپس آئی تو قافلہ جا چکا تھا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھی بیٹھی سو گئی اور صفوان بن معطل سلمٰی پیچھے سے آرہے "اور وہ میرے قریب آیا اور اُس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا کیونکہ پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے مجھے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے پہچان کر "انّا للہ وانّا الیہ راجعون" کہا۔ میں اس کی آواز سُن کر جاگ اُٹھی اور دوپٹہ سے مُنہ چھپا لیا"۔ (متفق علیہ)

الولد للفراش والی مشہور حدیث میں ہے کہ عتبہ بن ابی وقاص نے اپنے بھائی سعد کو وصیّت کی کہ زمعہ کی لونڈی کا بچہ میرا ہے اِسے لے لینا۔ چنانچہ سعد بن ابی وقاص نے وہ لڑکا لے لیا اور کہا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔ عبداللہ بن زمعہ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ بالآخر دونوں رسول کریم صلعم کی خدمت میں فیصلہ کے لیئے حاضر ہوئے۔ آپ نے لڑکا عبداللہ کو دلوا دیا اور فرمایا "الولد للفراش" بچّہ اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو۔ لیکن جب بعد میں لڑکے میں عتبہ کی مشابہت دیکھی تو ام المومنین حضرت سودہؓ بنت زمعہ کو اس سے

پردہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس لڑکے نے مرتے دم تک حضرت سودہ کو نہیں دیکھا۔ (متفق علیہ)

ایسے ہی اور واقعات بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شارع علیہ السلام نے منھ کو پوشیدہ کرنا پردے کے حکم میں شامل قرار دیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے جو عام حکم "اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا" دیا جا چکا ہے، وہ یہاں بھی نافذ ہوگا یعنی عورتیں اپنی آرائش کو ظاہر نہ کرتی ہوئی عام طور پر چہرہ پوشیدہ رکھیں گی۔ ہاں اگر اس کے باوجود ضرورت سے منھ یا ہاتھ وغیرہ کھولنا پڑیں یا اضطراراً ننگے ہو جائیں تو اس میں مضائقہ نہیں۔

گھروں کے اندر کی زندگی میں یہ حکم بیان ہو چکا ہے۔ وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِھِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِھِنَّ کہ وہ اپنے پاؤں اس طرح زمین پر نہ ماریں، جس سے اُن کی پوشیدہ زینت ظاہر ہو جائے۔ یعنی اگر ان کے پیروں میں کوئی زیور ہو (پازیب یا جھانجھ وغیرہ) تو اس طرح سے آواز پیدا ہو جو دوسروں کو سنائی دے اور وہ اُن کی طرف دیکھنے لگیں۔

اس سے یہ مطلب نہیں کہ گھروں کے اندر تو وہ ایسا نہ کریں لیکن باہر انھیں اس کی اجازت ہے۔ بلکہ اس کا یہ مقصد ہے کہ ایسی بات جس کی گھر کے اندر بھی اجازت نہیں، گھر کے باہر تو اس کی پابندی اور بھی ضروری ہے۔ یہی مقصد پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت رسول کریم صلعم نے حکم دیا ہے کہ عورت خوشبو لگا کر گھر سے باہر نہ جائے کیونکہ یہ بھی غیروں کی توجہ اس کی طرف مبذول کرنے کا باعث ثابت ہوگی (ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی) اور اس طرح زینت کو ظاہر نہ کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ کیونکہ آواز اور

خوشبو سے لوگ خواہ مخواہ ان کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

اسی لیئے دوسرا حکم دیا کہ اپنی چال ایسی رکھو جس سے شرم و حیا ٹپکے۔ ایسا نہ ہو کہ اسی سے دوسروں کی توجہ تمھاری طرف کھنچ جائے۔ دوسری چال سے متعلق ایک عام اصول بیان کیا گیا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا — اور تکبر سے لوگوں سے منہ نہ پھیرلے اور
تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللّٰهَ — نہ اکڑا اکڑ کر زمین پر چل کہ اللہ تعالیٰ
لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (لقمان ۳۱-۱۸) — کسی مغرور اور شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔

اگرچہ یہاں خطاب صیغہ مذکر سے کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتوں کو اجازت ہے کہ وہ اکڑتی ہوئی چل سکتی ہیں، بلکہ یہ قانونی طرز کلام ہے اور حکم مرد اور عورت دونوں کے لیئے یکساں ہے۔

قرآن میں چال سے متعلق ایک واقعہ بھی بیان ہوا ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مَدین کے شیخ کبیر کی دونوں صاحبزادیوں سے ملے ہیں اور بعد میں ان میں سے ایک اپنے والد کی طرف سے اُنھیں بلانے کو آئی ہے تو فرمایا ہے:۔

فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي — بعد میں ان دونوں میں سے ایک حیا سے
عَلَى اسْتِحْيَاءٍ (القصص ۲۸-۲۵) — چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

اگرچہ یہ ایک خاص واقعہ کا بیان ہے، مگر اس کے ذکر سے یہی ثابت ہے کہ عورت کی چال میں حیا مستحسن بات ہے۔ عورتوں کو باہر نکلنے کی ممانعت نہیں کیونکہ کام کاج کی ضرورت سے ایسا کرنے کی اجازت ہے لیکن آنکھ نیچی رکھیں۔ آرائش اور بناؤ سنگار کو ظاہر نہ کریں اور حیا سے چلیں۔ حضورؐ نے بھی فرمایا ہے کہ حیا ایمان کی ساٹھ شاخوں میں سے ایک

ثلث ہے (متفق علیہ)۔ غرض کہ اسلام حتی الوسع عورت اور مرد کے کھلم کھلا اختلاط کو پسند نہیں کرتا۔ عورت کا گھر سے باہر جانا ضرورت پر منحصر ہے نہ کہ نمائش کے لیئے اسی لیئے وہ کہتا ہے:۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى۔
(الاحزاب ۳۳ : ۳۳)

اور وہ اپنے گھروں میں وقار سے رہیں اور پرانے زمانۂ جاہلیت کی طرح اپنی آرائش کی نمائش نہ کرتی پھریں۔

لیکن اگر مجبورًا انہیں باہر جانا ہی پڑے تو مردوں کا فرض ہے کہ اُنھیں گھور گھور کر دیکھنا نہ شروع کر دیں۔ اسی لیئے مردوں کو "غضّ بصر" کی ہدایت کی۔ پہلی اضطراری اور غیر اختیاری نظر کا پڑ جانا منع نہیں لیکن اس کے بعد جانتے ہوئے مرد کا اُسے عمدًا دیکھنا ناجائز ہے۔ حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ "علی! عورت پر نظر پڑنے کے بعد دوبارہ نظر نہ ڈال۔ پہلی غیر ارادی نظر تیرے لیئے جائز ہے لیکن اس کے بعد دوبارہ دیکھنا جائز نہیں" (ترمذی۔ ابو داؤد) اور جریر بن عبد اللہ سے فرمایا کہ اچانک نظر پڑتے ہی فورًا اپنی نظر پھیر لو یعنی اسے دیکھتے ہی نہ رہو (مسلم۔ کتاب الآداب)

یہ احکام ان تمام لڑکیوں کے لیئے ہیں جو سنِ رُشد کو پہنچ جائیں اور جن پر لڑکی سے زیادہ لفظ عورت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور جب تک وہ خود نکاح کی خواہش مند ہیں یا ان کے لیئے نکاح کر لینے کا امکان ہے، اُن پر ان احکام کی پابندی لازم ہے۔ جب وہ اس حد سے تجاوز کر جائیں اور ایسی عمر کو پہنچ جائیں جہاں اُنھیں نکاح کی امید ہو نہ خواہش، تو اُنھیں اجازت دے دی کہ وہ چاہیں تو اوپر کا کپڑا (جلباب) جس سے اُنھوں نے اپنی زینت

کو چھپا رکھا تھا، بے شک اُتار دیں۔ اگرچہ پھر بھی احتیاط کو مدنظر رکھنے کی ہدایت کی:۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِيْنَةٍ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ (النور ۲۴ = ۶۰)	اور کبرسن عورتیں جنھیں نکاح کی امید نہ ہو، ان پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ اپنے اوپر کے کپڑے اتار دیں بشرطیکہ مقصد آرائش کی نمائش نہ ہو۔ اگرچہ وہ اس اس میں بھی احتیاط کریں تو اُن کے لیے بہتر ہے۔

(۲)

یتیموں کی نگہداشت

لڑکے یا لڑکی کا بچپن دو ہی طرح گذر سکتا ہے۔ اول یہ کہ خود اس کے والدین زندہ ہوں۔ اس صورت میں جو ذمہ داریاں والدین پر عائد ہوتی ہیں، ان کا بیان ہو چکا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بچہ یتیم ہو اور کسی دوسرے کی ولایت میں ہو۔ قرآن نے یتیم کے ولی پر سخت ذمہ داری عائد کرتے ہوئے یتیم کے حقوق کی نگہداشت کی خاص تاکید کی ہے۔

چونکہ یتیم لڑکا بھی ہو سکتا ہے اور لڑکی بھی، اس لیے قرآن نے قانونی زبان استعمال کرتے ہوئے کوئی تعیین نہیں کی اور لفظ یتیم کو عام رکھا ہے۔ اس جگہ ہم اس سے صرف عورت مراد لیں گے، اگرچہ یہی احکام یتیم لڑکے کے بارے میں بھی ہیں۔

فرمایا:۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ	اور وہ تم سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں (اُن سے) کہو (جس بات

لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَأَعْنَتَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (البقرہ ۲: ۲۲۰)	میں) ان (یتیموں) کی اصلاح (اور بہتری ہے وہ تمھارے لیئے بھی) بہتر ہے۔ اور اگر تم ان سے مل جل کر رہو تو وہ تمھارے بھائی بند ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں سخت مشکل میں ڈالتا۔ وہ اختیار والا اور حکمت والا ہے۔

اس ایک آیت میں ان تمام ذمہ داریوں کو بیان کر دیا جو یتیموں کے ولیوں پر عائد ہو سکتی ہیں:۔

سب سے اول فرمایا کہ یتیموں سے متعلق کسی خاص قانون اور اصول قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک شخص خود غور کر کے فیصلہ کر لے سکتا ہے کہ اُن کے لیئے کیا کرنا بہتر ہو گا۔ ان کی جان، ان کے مال، ان کے اخلاق، اُن کی تعلیم وغیرہ تمام امور میں جو بات بھی ان کے لیئے بہتر ہے، وہ کی جائے۔ ولی جس طرح اپنی اولاد سے متعلق فیصلہ کرتے ہوئے ہمیشہ ان کی بہتری اور بھلائی مدنظر رکھتا ہے اور اس پر توجہ اور محنت سے عمل کرتا ہے وہی حق ان یتیموں کا ہے۔

پھر فرمایا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ جو تم کر رہے ہو وہ صرف اُنھیں کے لیئے بہتری اور اصلاح کا موجب ہے بلکہ یہ تمھارے لیئے باعث خیر و برکت ہو گا۔ کیونکہ یہی یتیم بڑے ہو کر قوم کے افراد بنیں گے۔ اگر آج کم سنی میں ان کی تعلیم و تربیت کی کما حقہٗ نگہداشت نہیں کی جائے گی تو کل یہ اپنی بداخلاقی سے ساری قوم کو رُسوا کرنے والے ثابت ہوں گے۔ اگر آج ولی کی غفلت سے

ان کے اموال ضائع ہو گئے تو لا زماً یہ بڑے ہو کر مفلسی کا شکار ہونے کی صورت میں سارے خاندان اور قوم کے لیئے بدنامی کا باعث بنیں گے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ اُن سے ہل جُل کر رہو کیونکہ بہر حال وہ تمھارے بھائی بند ہیں۔ تمھیں ان سے مغائرت اور نفرت کرنا جائز نہیں۔ تمھارا فرض ہے کہ اُنھیں اپنے گھروں میں رکھو۔ ان سے میل جول میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے تاکہ اُنھیں یہ محسوس بھی نہ ہو کہ ہمارے ماں باپ ہمارے سروں پر موجود نہیں۔ جہاں ان سے میل جول میں امتیاز نقصان کا موجب ہو سکتا ہے وہیں اُن کے مال کو بھی بے کار نہ پڑا رہنے دو۔ اُسے بھی اپنے مال کے ساتھ ملا لو۔ اس سے تجارت کرو تاکہ تمھارے مال کے ساتھ ان کے مال میں بھی اضافہ ہو اور جب وہ بالغ ہو جائیں تو کسی دوسرے کے محتاج نہ ہوں اور اپنے مال و دولت سے خاندان اور قوم کے لیئے طاقت اور عظمت کا ذریعہ ثابت ہوں۔

اس آیت کی شانِ نزول میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (یعنی یتیم کے مال پاس تک نہ پھٹکو البتہ ایسے طریقے سے جو نیکی پر مبنی ہو) اور اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا (جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھا جاتے ہیں) تو جن لوگوں کی نگرانی میں یتیم بچے تھے اُنھوں نے سخت احتیاط برتنا شروع کر دی۔ ان کے کھانے کا سامان اپنے سامان سے علیحدہ کر دیا، اور اُن کے پینے کی چیزوں کو اپنی چیزوں سے الگ کر دیا اور جو کھانا یتیموں کے کھانے سے بچ رہتا اُسے اُٹھا رکھتے۔ یا تو یتیم ہی اُسے دوسرے وقت کھا لیتا یا وہ سڑ جاتا۔ یہ بات یتیموں کے سرپرستوں کو ناگوار

ہوئی اور اُنھوں نے رسول کریم صلعم سے اس کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں حکم نازل فرمایا۔ وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ۔ اس حکم کے نازل ہونے کے بعد لوگوں نے یتیموں کا کھانا پینا اپنے کھانے پینے کے ساتھ یک جا کر لیا۔ (ابو داؤد۔ نسائی)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالطت سے محض یتیموں کی اپنی ذاتی مخالطت ہی نہیں، بلکہ ان کے اموال کی مخالطت بھی مراد ہے۔

بعض لوگ یتیموں کو اس لیے اپنے گھروں میں رکھ لیتے ہیں کہ ان کے مال خورد برد کر جائیں اور ان کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھائیں۔ ایسے لوگوں کو ڈرایا، کہ ممکن ہے، تم دوسرے لوگوں کو یہ دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ کہ دیکھو، ہم یتیموں کو گھر میں رکھے ہوئے ہیں اور ان کے پالنے پوسنے کا سارا خرچ برداشت کر رہے ہیں۔ گویا یوں یتیموں پر اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگوں پر بڑا احسان کر رہے ہو۔ لیکن تم اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ اس سے تمھارا مقصد یتیموں کی پرورش سے زیادہ اپنے نفس کی پرورش ہے۔ پس خبردار ہو وہ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔

سب سے آخر میں اشارہ کیا کہ اگر تمھاری نیت درست ہے اور تم واقعی یتیم کی اصلاح اور اس کے اخلاق کی درستی اور اس کے اموال کی حفاظت کے مقصد سے اُسے اپنی سرپرستی میں لیتے ہو تو پھر تمھیں نہ دنیا کی لعنت ملامت کی پروا کرنا چاہیے، نہ اپنی کمزوریوں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں سے ڈرنا چاہیے۔ آج تک یتیموں کے ساتھ جو نا انصافی ہوتی رہی ہے، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان سے متعلق سخت احکام و قوانین نافذ

کیئے جاتے لیکن اللہ تعالیٰ تمھیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ صرف اتنا حکم دیتا ہے کہ تم اپنی وسعت اور عقل کے مطابق، جو کچھ اُن کے لیئے بہتر خیال کرتے ہو، اس پر عمل کرو اور نیک نیتی سے ان کی اصلاح اور تربیت کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ اسی میں برکت دے گا اور تمھاری بے اختیاری غلطیوں کی وجہ سے باز پُرس نہیں ہو گی۔

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۝ (النساء ۴ - ۲)

اور یتیموں کا مال دیانتداری سے، ان کے حوالے کرو اور اچھی چیز کو بُری سے نہ بدلو نہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر خورد بُرد کر جاؤ۔ ایسا فعل بہت بڑا گناہ ہے۔

چونکہ ان کے مال کی اپنے مال کے ساتھ مخالطت کی اجازت دی تھی اس لیئے فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم تجارت میں لگے رہو اور یتیموں کو اپنے ذاتی خرچ اور تعلیم وغیرہ کے لیئے تکلیف ہو۔ تمھارا فرض ہے کہ ان کے مال میں سے ان کو تعلیم دلاؤ اور ان کی دوسری ضروریات کو بھی مُہیا کرتے رہو اور اس امر میں ان کی حیثیت کا خیال رکھا جائے۔ اچھی چیز کو بُری سے بدلنے سے مراد ہے کہ ممکن ہے، یتیم کا مال و اسباب بہتر ہو اور اس کی خوبصورتی اور عمدگی دیکھ کر ولی کا دل للچا جائے اور وہ اپنی کم قیمت اور گھٹیا چیز اس سے بدل کر اُسے ہضم کر جائے۔ نیز یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ولی اپنا مال جو اس کے لیئے حلال اور طیب ہے چھوڑ کر یتیم کے مال کو جو اس کے لیئے حرام اور خبیث مال کی طرح ہے، غبن کرنا اور اُسے اپنی ذاتی کاموں میں خرچ کرنا شروع کر دے۔ اس لیئے فرمایا کہ تم یتیم کے اموال کو اپنے اموال کے ساتھ

شریک کر کے تجارت کر سکتے ہو بشرطیکہ تمھارا مقصد دیانتداری سے ان کے مال میں اضافہ کرتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ نیت تو اُسے خورد بُرد کرنے کی ہو اور ظاہر میں تجارت میں شرکت کر کے تم اُن سے ہمدردی جتاتے رہو اور آخر میں کہہ دو کہ تجارت میں گھاٹا پڑ گیا یا حساب ہی میں کسی طرح کی کمی بیشی کر کے دھوکا دے جاؤ۔ یہ سخت گناہ ہے۔ اس سے باز رہو۔ جو لوگ یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، ان سے متعلق وعید ہے :-

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۝ (النساء ۴ = ۱۰)	جو لوگ ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں وہ گویا (یہاں بھی) اپنے پیٹوں میں انگارے بھر رہے ہیں اور (آخرت میں تو) وہ دوزخ کی آگ میں جھونکے ہی جائیں گے

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا :-

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ (النساء ۴ = ۵)	تم اپنے مال کو نادان اور کم عمر لوگوں کے حوالے نہ کر دو، کیونکہ تمھارا مال و دولت اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیۓ معیشت اور زیست کا سامان بنایا ہے۔ ہاں انھیں اُن کے مال سے کھانے کو دو، پہننے کو دو اور انھیں نیک اور عمدہ تعلیم دو۔

چونکہ پہلے یتامیٰ کو ان کا مال دے دینے کا حکم دیا تھا، اس لیے یہاں اس امر کی وضاحت کر دی کہ مبادا کسی طرح کی غلط فہمی پیدا ہو جائے اور ولی ان کا مال تمام و کمال ان کے حوالے کر دیں۔ اس لیۓ پہلے مال کی اہمیت بیان کی کہ اگر مال نہ ہو تو دنیا میں انسان کے لیۓ زندگی مشکل

ہو جائے۔ لہٰذا اسے یُوں ہی ضایع مت کرو۔ اگرچہ یہ یتامیٰ ہی کا مال ہے، لیکن اگر وہ کم فہمی کی وجہ سے اس کا انتظام نہیں کر سکتے اور اس لئے اندیشہ ہے کہ وہ کہیں اُسے ضائع نہ کر دیں یا شاید دوسرے چالاک لوگ ہی گمراہ کر کے ان سے ہتیالیں تو اُسے اُن کے حوالے نہ کرو۔ ہاں تمھارا فرض ہے کہ ان کا مال اُنھیں پر مناسب طریقے سے صرف کرو۔ ان کی ضروریات مہیّا کرو اُنھیں لباس اور خوراک وغیرہ سے متعلق کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے دو۔ اچھی تعلیم دو اور خود بھی پند و نصیحت کرتے رہو تاکہ وہ آئندہ زندگی کی ذمّہ داریاں اُٹھانے کے قابل ہو جائیں اور جب اپنے مال و متاع کے انتظام کا بار اُن پر آن پڑے تو ان کے ہاتھ پاؤں نہ پھُول جائیں بلکہ وہ اس کے لیے پہلے سے تیار ہوں۔ اسی لیئے اگلی آیت میں فرمایا۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا۔	اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں (ہر طرح کی) صلاحیت پاؤ تو اُن کے اموال اُن کے حوالے کر دو اور (اس خوف سے) اُن کے مال کو فضول خرچی سے جلد جلد ضایع نہ کرو کہ وہ بڑے (ہونے پر طلب کرنے کے قابل) ہو جائیں گے
(النساء ۴ = ۶)	

ہم نے اس سے پہلی آیت میں " قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا " کے معنی نیک اور عمدہ تعلیم دینے کے لیئے تھے اور اس آیت میں امتحان کا ذکر ہونے سے یہی درست بھی معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں فرمایا کہ وقتاً فوقتاً ان کا امتحان لیتے رہو تاکہ پتہ لگے کہ وہ کتنی ترقی کر رہے ہیں یہاں تک وہ بالغ ہو جائیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بلوغ کی عمر کیا ہے۔ مثلاً امام شافعی نے فرمایا ہے کہ سن بلوغ ۱۵ برس ہے اس کے برخلاف امام ابو حنیفہ نے ایسے ۱۸ برس قرار دیا ہے۔ لیکن اصل معیار عمر نہیں بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ کیا یتیم اپنے معاملات کی دیکھ بھال کے قابل ہے یا نہیں۔ یزید بن ہرمز سے روایت ہے کہ نجدہ نے حضرت ابن عباسؓ سے خط لکھ کر پوچھا کہ یتیمی کی مدت کب ختم ہوتی ہے تو ابن عباس نے جواب دیا کہ "میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بعض آدمیوں کے داڑھی نکل آتی ہے اور وہ اپنے لین دین کے معاملات میں کمزور ہوتے ہیں۔ پس جب وہ اپنے معاملات کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے قابل ہو جائیں اور اُن فوائد کو حاصل کر سکیں جنھیں دوسرے لوگ حاصل کرتے ہیں تو ان کی یتیمی کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے" (مسلم کتاب الامارت) پس اصل چیز یہ دیکھنا ہے کہ یتیم میں کتنی صلاحیت ہے۔ کیا اس میں عقل کی پختگی آ گئی ہے کہ وہ اپنے نفع نقصان سے متعلق فیصلہ کر سکتا ہے اور اپنے کاروبار پر پورا تصرف کر کے اس کا مناسب انتظام کرنے کے قابل ہے۔ اگر عمر کے ساتھ یہ سب باتیں بھی وابستہ ہیں تو اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائے۔

آخر میں ولی کو ہدایت کی کہ محض اس خیال سے کہ وہ مال، اس کے اصلی مالک کے حوالے کرنا پڑے گا اور میرا حق تصرف اس پر سے اُٹھ جائے گا، یتیم کے مال میں سے بے جا خرچ اور اسراف کرنا شروع نہ کر دو۔ قرآن تو دشمن تک کے حقوق کی ادائیگی کو تقویٰ کا جزو قرار دیتا ہے۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا — کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس سے ناانصافی کرنے پر آمادہ نہ کر سکے (ہر حال میں)

هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ — انصاف کرو۔ یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔

(المائدہ ۵ = ۸)

ظاہر ہے کہ اگر دشمن سے بھی انصاف اور اس کے حقوق کی حفاظت کرنے کی ہدایت ہے تو یتامیٰ کے حقوق کا زائل کیا جانا کیسے گوارا کیا جاسکتا ہے جو اپنے ہی بھائی بند ہیں۔ دشمن تو ممکن ہے کہ قوی ہو اور خود اپنے حقوق منوانے پر قادر ہو سکے، یتامیٰ تو نادانی اور کمزوری کے سبب اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے بھی ناقابل ہیں۔ اس لیئے ان کے معاملے میں دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

پھر فرمایا:۔

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ۔ — اور اگر ولی امیر ہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ پرہیز کرے۔ ہاں اگر وہ حاجت مند ہے تو وہ مناسب طریقے پر اس میں سے لے سکتا ہے۔

(النساء ۴ = ۶)

یہاں ایک ایسی پیش بندی کی ہے جس سے متعدد خرابیوں کا سدِ باب ہو جاتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جہاں سرپرست کے کندھوں پر کسی یتیم کے جان ومال کی نگہداشت کا بوجھ آ پڑتا ہے تو وہ اُسے فضول بار سمجھ کر عدم توجہی برتتا ہے اور چونکہ اس کا سارا مال اس کی تحویل میں ہوتا ہے، یہ خیال کرکے کہ آخر جو اس کی نگرانی کی خدمت بجا لا رہا ہوں، میرا بھی تو حق ہے کہ اس کا کچھ معاوضہ لے لوں، وہ بعض اوقات غبن کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اس لیئے ہدایت کی، کہ جو ولی غنی اور امیر ہے اور اسے یہ ضرورت نہیں کہ وہ اس معمولی سی خدمت کے لیئے کچھ اجرت لے، تو وہ تو نہ لے۔ لیکن اگر ولی غریب ہے۔ اس کی معاش اور آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں اور جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے اس آیت

کی تشریح کی ہے (مسلم۔ کتاب التفسیر) واقعی اس کی کارکردگی سے یتیم کو فائدہ بھی پہنچ رہا ہے، تو دستور کے مطابق بقدرِ ضرورت اس میں سے اُجرت یا مشاہرہ لے سکتا ہے لیکن بالمعروف یعنی مناسب طریقے پر۔ اور مناسب طریقہ یہی ہے کہ برادری اور پنچائت کے لوگوں کو معلوم ہو، کہ کیا ہو رہا ہے تاکہ یتیم کا مال بھی محفوظ رہے اور بعد میں خود ولی پر بھی کسی طرح کا حرف نہ آئے۔ اس طرح اجرت لے لینے کی اجازت دے کر کمزور طبیعتوں کو غبن اور ناجائز تصرف کے گناہ سے بچا لیا۔

جب یتیم سنِ رُشد و بلوغ کو پہنچ جائے، تو اس کے اموال اس کے حوالے کر دیئے جائیں۔ لیکن ممکن ہے اور آئے دن کا تجربہ ہے کہ بعض لوگ سرپرست سے کسی دشمنی کا انتقام لینے کے لیئے، بعد میں یتیم کو گمراہ کر دیتے ہیں اور اس سے سرپرست پر تہمت لگوا دیتے ہیں، کہ اس نے مجھے اتنا مال کم دیا تھا اور اس طرح ولی بے چارے کو خواہ مخواہ کوفت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ اگر اپنا حق خدمت لو، تو برادری کے علم اور اجازت سے لو تاکہ تم پر غبن کا الزام نہ لگے۔ اب یتیم کا مال اس کے حوالے کر دینے کے پیچھے کسی شاخسانہ کے کھڑا ہونے کی پیش بندی یوں کی:۔

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ	پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرو
اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا	تو (اس لین دین کے معاملے میں) ان کے
عَلَیْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ	سامنے گواہ رکھ لو اور اللہ خوب حساب
حَسِیْبًا ه (النساء ۴ = ۶)	لینے والا ہے۔

غرض کہ ان کا مال ٹھیک ٹھیک حساب کر کے ان کے حوالے کر دو اور اس معاملے کے وقت بھی پنچائت کے معتبر آدمیوں کو بلا لو تاکہ بعد میں تمھیں

کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ولی کا فرض ہے کہ وہ یتیم کے مال کا پورا پورا حساب رکھے اور اس میں کسی طرح کی خیانت نہ کرے۔ کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ یاد رکھو، اللہ تعالیٰ سب سے بڑا حسیب، اور گناہوں پر سخت سزا دینے والا ہے، پس یتیم کے معاملے میں کسی قسم کے ناجائز تصرف کو راہ نہ دی جائے اور کوڑی کوڑی کا حساب کر کے اس کا مال اُسے سونپ دیا جائے۔

یتیموں کے اموال سے متعلق جو قرآنی احکام بیان ہوئے ہیں ان میں ہر جگہ جمع مخاطب کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان کی غرض وغایت یہ ہے کہ یتیم اور اس کی جائداد کی ذمہ داری سارے خاندان اور قوم کے سر پر ہے، جو قدرتاً حکومتِ وقت کی اجازت اور منظوری سے اُسے اُٹھا سکتی ہے۔ اگر سرکاری طور پر کورٹ آف وارڈس (Court of wards) وغیرہ اس فرض کو سرانجام دینے کے لئے مقرر کیئے جائیں، تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس یتیم کی نشوونما، اس کی تعلیم و تربیت اور ذہنی اور اخلاقی ترقی، اس کے مال کی حفاظت وغیرہ کا کام زیادہ عمدگی سے ہو سکتا ہو۔ اور نہ کورٹ آف وارڈس کی طرف سے بھی اگر یتیم کے کسی قریبی رشتہ دار کو اس کا سرپرست اور ولی مقرر کیا جائے تو اور بھی بہتر ہوگا کیونکہ اس طرح تعلقِ خاطر کی وجہ سے وہ اپنے کام کو زیادہ دلچسپی اور سرگرمی سے کرے گا۔

دوسرا باب

بیوی

پہلا مقصد نکاح محبت

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ (الروم ۳۰ = ۲۱)

اور اللہ تعالےٰ کے نشانوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے نفسوں سے تمھارے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمھارے درمیان محبت اور رحم کے جذبات قائم کیے۔ اس میں ان لوگوں کے لیئے جو غور کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی عظمت کے نشان ہیں۔

بائبل کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حوّا کو حضرت آدم کی پسلی سے پیدا کیا لکھا ہے:۔

"اور خداوند خدا نے آدم پر ایک گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس کی پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی۔ ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس لایا۔" (کتاب پیدائش ۲ = ۲۱ = ۲۲)

مگر قرآن سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ہے:۔

یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ	اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار
الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ	کرو جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے
وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا	پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑ پیدا
وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً	کیا اور پھر ان دونوں سے بہت سے
(النسآ۔ ۴ = ۱)	مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلائے۔

بعض لوگوں نے خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا کے وہی معنی لئے ہیں جو کتاب پیدائش کی مندرجۂ صدر آیتوں میں بیان ہوئے ہیں یعنی خدا نے پہلی عورت کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا، حالانکہ اس آیت کا مطلب صرف اتنا ہے کہ تمام مخلوق ایک باپ کی اولاد ہیں۔ یعنی ایک باپ کی اولاد، صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی اسی سے پیدا ہوئی ہیں۔ منھا کی ضمیر اسی نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ کی طرف راجع ہے جس سے خَلَقَکُمْ کہا گیا ہے۔ اور آخر میں کہا ہے کہ ان (ایک باپ کی اولاد) مرد اور عورتوں سے آگے نسل انسانی چلتی ہے۔ اس آیت سے کسی طرح یہ معنی نہیں نکلتے کہ حوّا، حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں کیونکہ یہاں خطاب عام ہے۔ اس میں صرف آدم ہی نہیں بلکہ سب لوگ —— گذشتہ اور موجودہ —— شامل ہیں اور یہ بالبداہت غلط ہے کہ سب عورتیں، مردوں کی پسلیوں سے پیدا ہوئی ہیں۔

رہا ان حدیثوں سے متعلق، جہاں ایک جگہ عورت کو پسلی سے تشبیہہ دی گئی ہے (المرأۃ کالضلع) اور دوسری جگہ اسے پسلی سے پیدا شدہ مانا ہے (فانھن خلقن من ضلع) (بخاری۔ کتاب النکاح)، تو یہاں بھی عام عورتوں کا ذکر ہے حضرت آدم یا حوّا کا نام تک نہیں در اصل ان دونوں جگہ

عورت کی تشبیہہ پسلی سے دے کر اس کی فطرت کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ بعض حضرات ایسی حدیثوں کو اسرائیلیات کا حصہ قرار دے کر بالکل نظر انداز کر دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی تھی۔

عربی کا یہ عام محاورہ ہے کہ بعض اوقات کسی صفت کی بافراط موجودگی کو یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ تو اس سے پیدا ہوا ہے۔ قرآن کریم نے انسان کی بعض صفات کو یوں تعبیر کیا ہے خُلِقَ الاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیا ۲۱ : ۳۷) یا خَلَقَکُمْ مِنْ ضُعْفٍ (الروم ۳۰ : ۵۴) دوسری جگہ ابلیس اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ (الاعراف ۱۲)

اب ظاہر ہے کہ عجل سے یہی مراد ہے کہ انسان میں عجلت اور تیزی کی صفت بدرجہ غایت ہے اور ضعف سے مقصود یہ ہے کہ فطرتاً انسان بہت کمزور واقع ہوا ہے۔ ورنہ عجل اور ضعف کوئی مادی چیزیں نہیں جن سے کچھ پیدا ہو سکے چہ جائیکہ انسان۔ اسی طرح ابلیس کی نار سے پیدائش سے بھی یہی ظاہر کرنا منظور ہے کہ وہ آتشی مزاج ہے اور انسان کا طین سے پیدا ہونا، اسے ان صفات سے متصف کرتا ہے جو طین کا خاصہ ہیں۔ اُردو میں بھی ایک ایسا ہی محاورہ مستعمل ہے، جب کہتے ہیں کہ فلاں شخص آگ کا پتلا ہے' تو اس سے بھی اس کے کردار کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ یہی محاورہ یہاں ان حدیثوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ کہہ کر کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے' اس کی اس عادت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ ضدی اور بے لچک فطرت لے کر آئی ہے اور جب کسی بات کا ایک اثر قبول کر لیتی ہے تو اس پر سختی سے قائم ہو جاتی ہے اور آسانی سے اپنی رائے بدلنے

پر تیار نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں گویا وہ اس پسلی کی مانند ہے جو ایک طرف ٹیڑھی ہو کر دوسری طرف مڑنا نہیں جانتی۔ مرد کا فرض ہے کہ وہ عورت کی اس خصوصیت کا خیال رکھے اور اس کی صحیح رہ نمائی کرے تاکہ وہ کوئی غلط اثر قبول نہ کرے۔ نہ یہ کہ اس کی فطرت کے خلاف اُسے کوئی کام کرنے پر مجبور کرے۔ کیونکہ پسلی اور عورت دونوں کے سیدھا کرنے کا نتیجہ ایک ہی ہوگا کہ دونوں ٹوٹ جائیں گی۔ چنانچہ محولۂ فوق دوسری حدیث کے آخری الفاظ میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ وان ذھبت تقیمھا کسرتھا وکسرھا طلاقھا۔ اگر تو اُسے سیدھا کرنا چاہے گا تو توڑ ڈالے گا اور اس کا توڑنا اسے طلاق دینا ہے۔

پس یہ غلط ہے کہ پہلی عورت (حوّا) مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت ہر حیثیت میں باعث سکون ہے خواہ اس کی حیثیت ماں کی ہو خواہ بیٹی کی یا بہن کی۔ وہ اپنے بیٹے یا باپ یا بھائی کے لیئے سامانِ راحت پیدا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سرشت میں نرمی اور ہمدردی بہت زیادہ رکھی ہے جس کے سبب وہ دوسروں کی تکلیف زیادہ محسوس کرتی اور ان کے لیئے سامان سکون و راحت مہیّا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ وہ سکون و راحت کا مظہرِ اتم اس وقت بنتی ہے، جب اس کی حیثیت بیوی کی ہوتی ہے۔ اس صورت میں جس خلوص اور محبت کا اظہار اس کی ذات سے ہوتا ہے، وہ داقعی اللہ تعالیٰ کے نشانات میں سے ایک نشان ہے۔ ماں یا بیٹی یا بہن، بہرحال ایک ایسی ہستی ہے جو ہمارے ساتھ ایک خونی رشتہ رکھنے کے نتیجے میں کسی حد تک فطرتاً مجبور ہے کہ ہم سے ہمدردی کرے لیکن بیوی کی صورت میں احساس فرض کے سوا

کہ شریعت الٰہی اور قانونِ ملکی نے اس کے ذمے چند فرائض لگا دیئے ہیں اور کوئی دنیوی رشتہ اُسے محبت اور وفا پر مجبور نہیں کرتا

(۲)

دوسرا مقصد نکاح بقائے نسل

قرآن نے عورت کی پیدائش کی دوسری غرض یہ بتائی ہے کہ اس سے نسلِ انسانی چلتی ہے چنانچہ وہ بیوی کو کھیتی سے تشبیہہ دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

نِسَاؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ (البقرہ ۲ = ۲۲۳) تمھاری عورتیں تمھاری کھیتی ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اناج اور غلہ کی بقاء کا انحصار کھیتی پر ہے اور اگر کھیتی نہ ہو تو اناج دنیا سے ناپید ہو جائے، اسی طرح نسلِ انسانی کی بقا عورت پر منحصر ہے اور عورت نہ ہو تو نسلِ انسانی ختم ہو جائے ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک عورت کا مقصدِ حیات دو گونہ ہے اول سامانِ سکون مہیا کرنا دوم نسلِ انسانی کی بقاء۔ اِن ہی دونوں مقاصد کی تشریح ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ فرمایا :۔ تزوجوا الودود والولود (ابوداود۔ نسائی) ایسی عورتوں سے شادی کرو جو بہت محبّت کرنے والی اور بہت اولاد جننے والی ہوں۔

اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایک مرد اور ایک عورت، کسی قسم کی ظاہری رسم پورا کیے بغیر، باہمی رضامندی سے، علانیہ یا خفیہ طور پر، زن وشو کی حیثیت سے رہنے لگیں۔ جیسے آج کل مغرب کے بعض ممالک میں رواج صداقہ یا یارانہ شادی Companionate marriage کا پر شوکت نام دیا گیا ہے ۔ دوسری وہ شکل ہے جو شریعت اور ملکی قانون کے بعض خاص اصولوں کے تحت سر انجام دی جاتی ہے اور عرفِ عام

میں نکاح کہلاتی ہے۔

قرآن پہلی قسم کے تعلق کے خلاف ہے چنانچہ اس نے عورت کو حرث یعنی کھیتی سے تشبیہ دے کر اپنا مقصد واضح کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک مرد اور عورت کو رشتۂ نکاح سے وابستہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کا یہ تعلق مستقل حیثیت کا ہو۔ کسان یہ نہیں کرتا کہ آج کھیتی لے لی اور کل اُسے چھوڑ دیا بلکہ وہ اس سے نفع حاصل کرنے کی خاطر اسے دائمی طور پر اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔ دوسرے وہ اس سے غلہ اور اناج حاصل کرتا ہے وہ اسے یوں ہی بنجر نہیں چھوڑ دیتا۔ تیسرے جب وہ اس میں بیج ڈالتا ہے تو جب تک فصل تیار نہیں ہو لیتی وہ ہر طرح اس کی دیکھ بھال کرتا ہے، یہ نہیں کہ بیج بو دیا اور گھر آن کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ رہا۔

دیکھ لیا جائے کہ یارانہ شادی میں ان میں سے کوئی ایک چیز بھی موجود ہے۔ اس میں تعلق عارضی ہوتا ہے، جو اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ دوسرے اس کی غرض اولاد پیدا کرنا نہیں بلکہ عیش و عشرت ہے۔ اور اسی لیئے اگر تمام پیش بندیوں کے باوجود، کہیں اتفاق سے ایسے جوڑے کے یہاں بچہ ہو جائے تو عموماً دونوں میں جدائی ہو جاتی ہے۔ یہ سب باتیں قرآنی مقصدِ نکاح کے خلاف ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسلام ایسے تعلق کو نکاح سے تعبیر ہی نہیں کرتا جس میں مرد اور عورت دونوں کسی ذمہ داری کا خیال کیئے بغیر میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ اس کی نظر میں یہ گناہ ہے اور وہ اس کی مذمت کرتا ہے۔

قرآن جیسی سماج بنانا چاہتا ہے، اس میں تو عورت کھلے بندوں غیر محرموں کے سامنے تک نہیں آسکتی، کجایہ کہ وہ علی الاعلان یا خفیہ طور پر کسی غیر محرم مرد کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہنے لگے۔ وہ ایسے فعل کو جرم

اور مستوجبِ سزا قرار دیتا ہے۔ اس کی یہ کوشش ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو، سماج کو فحش اور گناہ سے پاک رکھا جائے اور اس مقصد کے حاصل کرنے کا ایک طریقہ اُس نے یہ بتایا ہے کہ مرد اور عورت اپنے اپنے دائرۂ عمل میں رہیں۔ عورت گھر میں رہے اور مرد باہر۔ جب دونوں میں سے کوئی دوسرے کی حدود میں داخل ہو تو وہ بعض اصولوں کی پابندی کرے۔ وہ دونوں آزادی سے صرف دو حالتوں میں یکجا ہو سکتے ہیں یعنی یا ان دونوں کا نکاح شریعت کی رو سے حرام ہو یا پھر وہ شرعی میاں بیوی ہوں۔ یہ رشتہ قانون طور پر اختیار کیا جائے۔ سماج اسے منظور کرے اور اُسے اس کا علم ہو اور اس میں کوئی بات خفیہ نہ ہو، بلکہ وہ دونوں علی الاعلان میاں بیوی کی طرح رہیں۔ اس کے علاوہ اسلام میں مرد اور عورت کسی طرح جمع نہیں ہو سکتے۔ اس کی نظر میں تمام دوسری حالتیں زنا کی مختلف صورتیں ہیں وہ ان سے منع کرتا ہے اور ان کے لیے سزا مقرر کرتا ہے۔

فحش اور زنا

سب سے پہلے ایک ایسی صورت سے متعلق ارشاد ہوتا ہے، جو اگرچہ عملی لحاظ سے زنا کے برابر نہ ہو لیکن اپنے نتائج میں بہت اہم اور خطرناک صورت اختیار کر لے سکتی ہے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ	اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدچلنی
مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا	کی مرتکب ہوں تو چاہیئے کہ (اپنے مردوں
عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ	میں سے) چار آدمیوں کی شہادت لو۔
فَاِنْ شَهِدُوْا	اگر (چار شخص) گواہی دے دیں (کہ
فَاَمْسِكُوْهُنَّ	واقعی وہ بدچلنی کی مرتکب ہوئی ہیں)
فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی	تو پھر ایسی عورتوں کو گھروں میں بند رکھو

يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ	یہاں تک موت ان کی عمر پوری کر دے
يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا	یا پھر اللہ ان کے لیے کوئی دوسری
(النساء ۴ : ۱۵)	راہ پیدا کر دے۔

فحش کے معنوں میں بہت وسعت ہے۔ اس سے محض سخت کلامی اور کوئی ناپسندیدہ فعل بھی مراد ہو سکتی ہے اور دوسری طرف اس کے معنی زنا بھی ہو سکتے ہیں۔ چونکہ قرآن میں دوسری جگہ زنا کا ذکر ہے جہاں اس کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں فحش سے زنا مقصود نہیں بلکہ ایسا فعل ہے جو عورت کے اخلاق اور عفت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُسے نہیں کرنا چاہیئے تھا اور جو بڑھ کر اُسے زنا کے آخری جرم کے ارتکاب پر آمادہ کر دے سکتا ہے۔ ایسی صورت میں حکم دیا کہ فتنے کو سر اُٹھاتے ہی دبا دو تاکہ بڑھنے نہ پائے اور اس کی سزا یہ تجویز کی کہ مجرم عورت کی آزادی چھین لو اور اس کی آزادانہ باہر کی آمد و رفت پر پابندی لگا دو تاکہ نہ خود اسے مزید گناہ کے ارتکاب کا موقع ملے، نہ وہ دوسروں کے لیے بُری مثال بن سکے۔ اور یہ جو دوسری راہ کا ذکر ہے اس سے مراد یہی ہے کہ غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں ان کا نکاح کر دیا جائے یا پھر وہ توبہ کریں جیسے کہ اس سے اگلی آیت کے آخر میں مردوں کے بیان سے ظاہر ہے:-

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا	اور اگر تم میں سے دو شخص بدچلنی کے مرتکب ہوں
فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا	تو چاہیئے کہ ان دونوں کو اذیت پہنچاؤ۔ پھر
عَنْهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا	پھر اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح
رَّحِيْمًا ۝	کرلیں تو اُنھیں چھوڑ دو۔ بلاشبہ اللہ بڑا ہی
(النساء ۴ : ۱۶)	توبہ قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

زنا کی پہلی سزا سو کوڑے

ان دونوں سے متعلق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں بد چلنی سے مراد زنا ہے اور بعض دوسروں (مثلاً ابو مسلم اور مجاہد) کے خیال میں یہاں فحش سے سحاقت اور لواطت مقصود ہے اور زنا کی حد کا ذکر سورۂ نور کی اس آیت میں ہے:-

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(النور ۲۴ = ۲)

زانی مرد اور زانیہ عورت (کی سزا یہ ہے کہ) ان میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ دین کے معاملے میں رحم تمھارے راستے میں روک نہیں بننا چاہیئے، اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو اور چاہیئے کہ مجرموں کو سزا دیتے کے وقت مومنوں کی ایک جماعت وہاں موجود ہو۔

جلدہ کے معنی ہیں ایسی چیز سے مارنا جس سے مضروب کی جلد تک اثر پہنچے۔ دُرّے کے ساتھ مارنے کا رواج خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رض کے عہد سے شروع ہوا اور کوڑے کا خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی ذی النورین رض کے زمانے میں۔ اس سے پہلے کبھی پتھر مارا جاتا تھا، کبھی جوتا، کبھی درخت سے کٹی ہوئی تازہ لکڑی۔ غرض یہ ہے کہ انسان کی جلد تک اثر ہو اور مضروب کو اذیت پہنچے ورنہ در اصل اسلام کا مقصد جسمانی سزا دینے میں اذیت سے زیادہ رسوائی ہے۔

کوڑا کسی ایسی جگہ پر مارنا جائز نہیں جس سے موت واقع ہو جانے کا اندیشہ ہو یا انسان کی شکل یا کسی عضو میں نقص پیدا ہو جائے۔ اگرچہ جسم کو

بالکل ننگا کر کے سزا دینے کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا، لیکن یہ بھی بے معنی ہے کہ مجرم کے جسم پر اتنے کپڑے چھوڑ دیئے جائیں جس سے جلد تک ضرب کا اثر ہی نہ پہنچے اور سزا کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ جسمانی سزا سخت رسوائی کا باعث ہے اور دوسرے لوگوں کی موجودگی ہے جہاں مجرم کو زیادہ سے زیادہ رسوا کرنا منظور ہے وہیں خود ان کے لیئے بھی عبرت کا سامان مہیا کرنا مدعا ہے

سنگساری

یہاں بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے منسوب بعض روایتوں کی بنا پر جلدہ سے رجم (سنگساری) مراد لیا ہے۔ لیکن تھوڑے سے تدبر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ روایتیں غلط ہیں چنانچہ سیوطی نے اتقان میں ان سب کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔ کیونکہ کوئی شخص قرآن کے اس صریح حکم میں کمی بیشی کرنے کا مجاز نہیں جو سورۂ نور کی اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ ان تمام روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر شادی شدہ مرد یا عورت زنا کے مجرم ہوں تو انھیں سنگسار کیا جائے اور اگر فریقین میں سے ایک یا دونوں غیر شادی شدہ ہوں تو غیر شادی شدہ مجرم کو کوڑوں کی سزا دی جائے۔ لیکن یہ امتیاز بے معنی ہے۔ زنا کے معنی میں کوئی شبہ نہیں۔ شرعی نکاح کے بغیر کسی عورت سے خلوت صحیحہ زنا ہے۔ پھر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی تفریق کی کیا بنیاد ہے؟ ہاں لونڈی کے لیئے جو آزاد ہو کر کسی کے نکاح میں آئے خود قرآن نے اس سے نصف سزا مقرر کر دی ہے (النساء ۴ = ۲۵) بلکہ وہاں "نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ" کے الفاظ خود اس امر کی دلیل ہیں کہ قرآن کی رو سے رجم کی سزا نہیں ملے گی اور صرف سَو کوڑے ہی لگائے جائیں گے، کیونکہ سَو کا نصف تو پچاس ہو سکتا ہے، سنگساری کا نصف کیا ہوگا۔ دوسرے "نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ" ہی سے یہ بھی ثابت ہے کہ لونڈی کو اس سزا کا نصف دیا جائے گا جو محصنہ کو دی جاوے گی۔ محصنہ سے متعلق صرف اسی

جگہ قرآن میں مذکور ہے کہ اُسے مائۃ جلدۃ کی سزا دی جائے رجم کا کسی جگہ ذکر نہیں۔ اور کیسے ممکن ہے کہ محصنہ کو رجم کی سزا دینا مقصود ہوتا اور قرآن اس کا ذکر نہ کرتا۔

حدیث ہماری رہ نمائی اُسی وقت کر سکتی ہے جب کسی مسئلے سے متعلق قرآن میں کوئی تصریح نہ ہو یا ایک حکم قرآن میں مذکور تو ہو، مگر اجمال ہو، تفصیل نہ ہو۔ اس وقت بے شک ہم حدیث سے استصواب کریں گے۔ لیکن حدیث کی صحت پرکھنے کے لیئے یہ کسوٹی ہے کہ وہ تعلیم اسلام کے عام اصولوں کے مطابق ہو اور قرآن کے کسی دوسرے حکم کے معارض نہ ہو، کیونکہ بہر حال حدیث، قرآن پر قاضی نہیں ہو سکتی یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے قرآن پر ترجیح دی جائے

ہم رجم کے مسئلے میں کیا دیکھتے ہیں کہ قرآن میں اس سے متعلق کہیں ذکر نہیں اور تمام بحث حدیثوں کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور یہ حدیثیں بھی ایسی ہیں جو درایت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "خدا نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بھیجا اور ان پر اپنی کتاب نازل کی اور خدا نے جو احکام رسول کریم صلعم پر نازل فرمائے، ان میں آیت رجم بھی تھی۔ ہم نے اس آیت کو پڑھا اور اسے محفوظ کر لیا رسول اللہؐ نے سنگساری کی سزا دی ہے اور اُن کے بعد ہم نے بھی دی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ جب لمبی مدت گذر جائے، تو کوئی کہنے والا کہہ دے کہ آیت رجم تو قرآن میں موجود نہیں اور اس طرح وہ ایک خدا کے نازل کردہ حکم کو ترک کر کے گمراہ ہو جائے۔" (متفق علیہ) اسی سلسلے میں بعض اور روایتیں بھی حضرت عمرؓ سے روایت کی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ اللہ تعالےٰ نے آیت رجم نازل کی تھی اور اگر مجھے لوگوں کا ڈر نہ ہوتا کہ وہ اعتراض کریں گے تو میں اس آیت کو قرآن میں لکھ دیتا" کیا یہ روایتیں ماننے کے قابل ہیں؟ کیا یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم نازل ہوا اور خود رسول اللہؐ نے اُسے درج قرآن نہ کیا ہو؟ یا پھر حضرت عمرؓ کی سیرت کو جانتے ہوئے یہ ماننا کہ اُنھوں نے لوگوں کے

ڈر سے ایک حق بات پر عمل کرنے سے احتراز کیا۔ یہ دونوں باتیں بعید از فہم ہیں۔ ان روایتوں کے ماننے کا یہ مطلب ہے کہ قرآن کا "اَلْکِتَابَ مُفَصَّلًا" اور "کُلٌّ فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ" کا دعوی ٹھیک نہیں اور یہ نامکمل کتاب ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ یہ ماننا کہ کوئی ایسی وحی جو احکام پر مشتمل تھی اور اب اس میں موجود نہیں "اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ" کے الٰہی وعدے کے بھی خلاف ہے۔

پھر حضرت علیؓ کی شہادت، حضرت عمرؓ کی روایت کے خلاف ہے۔ اُنھوں نے ایک شادی شدہ عورت شراحہ نامی کو جلدہ اور رجم، دونوں سزائیں دیتے ہوئے فرمایا، کہ میں کتاب اللہ کی رو سے اسے کوڑوں کی سزا دیتا ہوں اور سنت رسول اللہ کی رُو سے سنگساری کی۔ گویا اُنھوں نے تسلیم کیا کہ کتاب اللہ میں تو کوڑوں ہی کا ذکر ہے سنگساری کا نہیں اب رہا یہ سوال کہ کیا رسول اللہ رجم کی سزا دیا کرتے تھے۔ تو اس میں شک نہیں کہ متعدد حدیثوں سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے شادی شدہ زنا کرنے والوں کو سنگساری کی سزا دی ہے (مثلاً دیکھو صحیح مسلم۔ کتاب الحدود) لیکن غالباً یہ سب کچھ اسی وقت تک ہوا، جب تک کہ اس سلسلے میں صریح حکم نازل نہیں ہوا تھا اور آپ تورات کے احکام کی پابندی کرتے تھے۔

اسلام سے پہلے شریعتِ موسوی میں سزائے رجم کی موجودگی کا ثبوت انجیل سے ملتا ہے جیسا کہ فریسیوں کے حضرت مسیح علیہ السلام سے اس سوال سے ظاہر ہے "اے استاد! یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی۔ موسیٰ نے تو تورات میں ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں، پھر تو کیا کہتا ہے" (یوحنا۔ ۸: ۴-۵) حدیث نبوی سے بھی تورات میں رجم کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ (روایت عبداللہ بن عمر۔ متفق علیہ) تورات کے متداول نسخوں میں زنا کا قانون کتاب استثنار

کے باب ۲۲ - میں بیان ہوا ہے لیکن اس کی شکل باوجود پوری تفصیل کے بہت مسخ شدہ ہے ــــ بہر حال اس میں بھی بعض حالتوں میں زنا کی سزا سنگساری ہی مقرر کی گئی ہے -

حضور علیہ السلام کا یہ دستور یہ تھا کہ اگر کسی امر سے متعلق کوئی صریح حکم نازل نہیں ہوا اور اس میں شرک نہ ہوتا، تو آپ شریعت موسوی کی پابندی کرتے جیسا کہ قبلہ کے بارے میں ہوا. جب تک حرم کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم نازل نہیں ہوا، آپ یہودیوں کے قبلہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے - اسی طرح قیام مکہ کے دوران میں بلکہ ہجرت کے بعد بھی آپ صوم عاشورہ کے پابند رہے لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو آپ نے عاشورہ کا روزہ ترک کر دیا -

یوں معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی سزا کے سلسلے میں بھی آپ اسی اصول پر کاربند رہے - جب تک سورۂ نور کی حد کا حکم نازل نہیں ہوا، آپ تورات کی سزا سنگساری پر عمل کرتے رہے اور جب جلدہ کی سزا متعین ہو گئی تو آپ نے سنگساری کی سزا ترک کر دی اور سو کوڑے کی سزا دینے لگے -

زنا کی دوسری سزا اخراج -

سو کوڑوں کے علاوہ قرآن نے زانی اور زانیہ کی دوسری سزا یہ مقرر کی ہے -

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ	زانی مرد، زانیہ عورت یا مشرکہ عورت کے سوائے کسی اور سے نکاح
اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ	نہیں کر سکتا اور زانیہ عورت بھی زانی
لَا يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ	یا مشرک مرد کے سوائے کسی اور سے
وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى	نکاح نہیں کر سکتی اور مومنوں پر

الْمُؤْمِنِيْنَ ٥ (النور ۲۴ = ۳) حرام کر دیا گیا ہے۔

دوسری جگہ حکم دیا ہے کہ مومن مرد کا مشرکہ عورت اور مومنہ عورت کا مشرک مرد سے نکاح مت کرو۔ (البقرہ ۲ = ۲۲۱) اور یہاں سورۂ نور میں کہا ہے کہ مسلمان زانی مرد اور زانیہ عورت کا نکاح، اب اُن کے مثل یا مشرک ہی سے ہو سکتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے ایسے صریح حکم کی خلاف ورزی کرنے والا مرد اور عورت اب مسلمان ہی کہاں رہے کہ اُنھیں اسلامی قانون کا پابند سمجھا جائے۔ ابو ہریرہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص بحالتِ ایمان زنا نہیں کرتا (بخاری) یا فرمایا کہ زانی زنا کرتے وقت مومن نہیں رہتا (مسلم) وجہ ظاہر ہے کہ مومن وہ ہے جو خدا کے احکام کی پابندی کرتا ہے اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلعم جن شرطوں پر بیعت لیا کرتے تھے ان میں ایک شرط زنا نہ کرنے کی بھی ہوا کرتی تھی (متفق علیہ) پس جب کسی مسلمان نے زنا جیسے فعل شنیع کا ارتکاب کیا تو اس نے معاہدۂ بیعت کی ایک شرط کی خلاف ورزی کی، جس سے معاہدہ باطل ہو گیا۔ اب وہ شخص گویا بیعت سے خارج ہو گیا اور مسلمان ہی نہیں رہا۔ ایسا مرد اور عورت آزاد ہیں۔ وہ چاہیں تو مشرک مرد یا عورت سے نکاح کر لیں۔ لہٰذا ان دونوں مقامات میں کوئی تضاد نہیں۔ انھیں معنوں میں ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں (لا ینکح الزانی المجلود الا مثلہ) ایسا زانی شخص جس پر جلدہ کی حد قائم ہو چکی ہے، وہ کسی اپنی طرح کی عورت ہی سے نکاح کرے۔ چنانچہ ایک مسلمان نے شادی شدہ ہونے کی حالت میں ارتکاب زنا کیا تو حضرت علیؓ نے اِس حکم کے ماتحت اس نکاح فسخ کرا دیا اور کہا کہ اب تو اپنے جیسی کسی زانیہ عورت ہی سے نکاح کر سکتا ہے۔ وہ لوگ جو کسبیوں سے نکاح کر لیتے ہیں، وہ قرآن کے اس حکم کے خلاف کرتے ہیں۔

چار گواہ اس سے ثابت ہوا کہ زنا کی سزا دوہری ہے۔ سو کوڑے کی جسمانی سزا اور جماعت سے اخراج۔ چونکہ سزا ایسی سخت مقرر کی تھی، اس لیئے تاکید کی، کہ جرم کے ثبوت میں کافی شہادت مہیا کی جائے تاکہ محض کسی دشمن کے کہہ دینے سے حد نافذ نہ کر دی جائے۔ اگر وہ گواہ نہ لا سکیں، تو اس صورت میں فرمایا:-

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النور ۲۴ = ۴ - ۵)	اور وہ لوگ جو پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ پیدا نہ کر سکیں، انھیں اسّی کوڑوں کی سزا دی جائے اور اس کے بعد کبھی ان کی شہادت قبول نہ کی جائے، کیونکہ وہ جھوٹے ہیں۔ ہاں اگر وہ اس کے بعد توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں، تو پھر یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

لعان حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ ہلالؓ بن امیہ نے حضرت رسول کریم صلعم کے پاس آکر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگایا۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو تم چار گواہ لاؤ یا تمھاری پشت پر حد لگائی جائے گی۔ اس نے کہا، یارسول اللہ! اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس کسی غیر مرد کو دیکھے تو کیا وہ گواہ تلاش کرتا پھرے۔ لیکن آپؐ یہی فرماتے رہے کہ گواہ لاؤ ورنہ حد لگائی جائے گی۔ اس وقت ہلالؓ نے عرض کیا یارسولؐ اللہ! خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بری کر دے گا، کیونکہ

میں سچا ہوں۔ اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی (متفق علیہ)۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ۔ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

(النور ۲۴ = ۶ - ۹)

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں اور سوائے اپنے اور کوئی شہادت نہ رکھتے ہوں تو ان میں سے ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ وہ چار بار خدا کی قسم کھائے کہ میں سچا ہوں اور پانچویں بار کہے کہ مجھ پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں اور اسی طرح عورت بھی سزا سے یوں ہی بچ سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کے ساتھ چار بار شہادت دے کہ وہ (تہمت لگانے والا مرد) جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو اگر یہ شخص اپنے دعوے میں سچا ہے۔

ان قسموں کو شریعت میں لعان کہتے ہیں کیونکہ اس میں فریقین ایک دوسرے پر جھوٹا ہونے کی صورت میں لعنت کرتے ہیں۔ لعان کا لازمی نتیجہ طلاق ہے۔ اس کے بعد وہ مرد اور عورت بطور میاں بیوی نہیں رہ سکتے۔ ان میں لازماً علیحدگی ہو جائے گی علیحدگی ہونے کی صورت میں مرد کا کوئی حق نہیں کہ وہ اس عورت سے اپنے مال (یعنی مہر وغیرہ) میں سے کچھ واپس لے (متفق علیہ) اور جو بچہ اس عورت کے پیدا ہوگا، وہ عورت کے پاس رہے گا (مسلم۔ کتاب اللعان) کیونکہ مرد تو اس سے پہلے ہی بری الذمہ ہو چکا ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ قرآن شرعی نکاح کے سوائے، اور کسی صورت میں عورت

اور مرد کے تعلقات زناشوئی کو تسلیم نہیں کرتا۔ سورہ نساء کے اس مقام سے بھی ملتا ہے، جہاں عورتوں کی فہرست گنوائی ہے، جن سے نکاح کرنا حرام ہے۔ اس فہرست کے آخر میں فرمایا:۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ۔ (النساء ۴ = ۲۴)	تمام آزاد یا بیاہی ہوئی عورتیں تم پر حرام ہیں سوائے ان کے جن سے تم نے خود نکاح کیا ہے۔

محصنہ کے معنی ہیں خاوند والی یا آزاد عورت۔ اسی لیئے ہم نے دونوں معنی لکھ دیئے ہیں۔ دوسرے اس صورت میں یمین کے معنی معاہدہ کیئے جائیں گے اور نکاح بھی ایک معاہدہ ہے۔ نہ صرف لغت کی رو سے یمین کے معنی نکاح درست ہیں بلکہ مفسرین نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ اگر یوں معنی کیئے جائیں تو اِلَّا استثنائے منقطع کے معنوں میں ہوگا اور آیت کا یہ مطلب ہوگا۔

"تمھارے لیئے بیاہی ہوئی عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے مگر جو عورتیں تم نے خود بیاہی ہیں (وہ تم پر حرام نہیں)"

یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے کہ نکاح یہاں عام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ صرف مسلمان شادی شدہ عورتیں ہی تم پر حرام ہیں، بلکہ دوسرے مذاہب کی عورتوں پر بھی یہ حکم حاوی ہوتا ہے۔ قرآن نے ان کی رسم نکاح کو بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ مسلمانوں کو حکم دیا:۔

لَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (الممتحنہ ۶۰ = ۱۰)	کافر عورتوں کے عقد نکاح کو روک نہ رکھو۔

اور پھر فرمایا کہ اگر کافر عورتیں اسلام قبول کرلیں تو تم ان کے پہلے خاوندوں کو ان کے ادا کیئے ہوئے مہر دے کر ان سے شادی کر سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ

حالتِ کفر کے نکاح کو تسلیم کیا ہے۔ المختصر کوئی بھی عورت ہو، اگر وہ تمھاری منکوحہ بیوی نہیں تو وہ تم پر حرام ہے اور نکاح کے بغیر اس سے تعلقات زنا شوئی زنا کی حد میں آئیں گے۔ اور اس کے لیئے زنا کی حد مقرر ہے۔

تیسرا مقصد نکاح انسدادِ فسق

قرآن صاف حکم دیتا ہے کہ تم نکاح کرو وَ اَنْکِحُوا الْاَیَامیٰ مِنْکُمْ (النور ۲۴ ع ۳۲) تم اپنے مجرد مردوں اور عورتوں کے نکاح کر دو۔ نکاح کی دو غرضیں تو وہی ہیں جو اوپر بیان ہو چکی ہیں کہ مرد اور عورت باہمی محبت اور مودت سے رہیں اور ایک دوسرے کے لیئے تسکین اور اطمینان کا باعث ہوں اور دوسرے اس سے نسل انسانی کی بقار مقصود ہے۔ تیسری غرض یہ ہے کہ اس طرح سماج میں گندگی اور فسق و فجور نہیں پھیلیں گے۔ اس سے مرد اور عورت دونوں کی عصمت اور عفت محفوظ ہو جائے گی۔ قرآن نے نکاح کے لیئے نہایت بلاغت سے کئی مقامات پر ایک لفظ احصان استعمال کیا ہے اور مرد کو مُحصن اور عورت کو مُحصنہ کہا ہے۔ حصن کے معنی ہیں قلعہ اور احصان قلعہ بندی کو کہتے ہیں۔ پس جو شخص اپنی حفاظت کا پورا انتظام کر کے دشمنوں کے حملہ سے پناہ میں آگیا وہ محصن اور ایسی عورت محصنہ ہے۔ جب ایک مرد اور ایک عورت، رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر گھر گرستی کر لیتے ہیں تو وہ گویا گھر نہیں بناتے، بلکہ ایک قلعہ تعمیر کرتے ہیں اب وہ شیطان کے حملوں سے محفوظ ہو گئے۔ ان کی اخلاقی اور روحانی بلکہ جسمانی زندگی پر بھی کسی دشمن کی زد نہیں پڑ سکتی۔

مُحرّماتِ نکاح

اسلام نے نکاح پر سب سے پہلی پابندی یہ عائد کی کہ بعض عورتوں سے نکاح حرام قرار دے دیا۔ جاہلیت

میں رواج تھا کہ کسی شخص کی موت کے بعد اس کی بیویاں بھی اس کے ترکے کا حصہ تصور کی جاتی تھیں اور متوفی کا بیٹا اپنی سوتیلی ماں سے شادی کر لیتا تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے اس بُری رسم کو حرام ٹھہرایا اور اس کے بعد دوسری عورتوں کا ذکر کیا، جن سے نکاح جائز نہیں :-

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۤؤُكُمْ
مِّنَ النِّسَاۤءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ
اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا
وَّسَاۤءَ سَبِيْلًا ۝ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ
اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَ
اَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَ
خٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ
وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ
الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ
مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ
نِسَاۤىِٕكُمْ وَرَبَاۤىِٕبُكُمُ
الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ
نِّسَاۤىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ
بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا
دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ وَحَلَاۤىِٕلُ اَبْنَاۤىِٕكُمُ الَّذِيْنَ
مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا

اور ان عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ لاؤ (۱) جنھیں تمھارے باپ نکاح میں لا چکے ہیں۔ ہاں اس حکم سے پہلے جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ یہ کروہ اور مردود شیوہ تھا اور بُرا دستور (اس کے علاوہ) تم پر (یہ عورتیں بھی) حرام ہیں (۲) تمھاری مائیں (۳) تمھاری بیٹیاں (۴) تمھاری بہنیں (۵) تمھاری پھوپھیاں. (۶) تمھاری خالائیں (۷) تمھاری بھتیجیاں (۸) تمھاری بھانجیاں (۹) تمھاری رضاعی مائیں (۱۰) تمھاری رضاعی بہنیں (۱۱) تمھاری بیویوں کی مائیں (۱۲) تمھاری بیویوں کی گیارۂ اولاد جو تمھاری ربیبہ ہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ زناشوئی کا تعلق ہو گیا ہو دگرنہ پھر ان لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں کوئی گناہ نہیں (۱۳) تمھارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں (۱۴) نیز یہ بھی حرام ہے کہ تم دو سگی بہنوں کو بیک وقت

بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ٥ (النساء ۴ = ۲۲ - ۲۳)

نکاح میں جمع کرو۔ ہاں اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ اللہ بہت بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

یہ حرمت تو رشتہ داروں سے متعلق فرمائی۔ ان کے علاوہ عورتوں کا ایک اور طبقہ بھی حرام ٹھہرایا۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء ۴ = ۲۴)

اور تمام بیاہی ہوئی عورتیں بھی سوائے ان کے جو تمہارے قبضے میں آگئی ہیں (تم پر حرام ہیں) یہ اللہ کی طرف سے جاری کردہ قانون ہے ان کے علاوہ (تمام دوسری عورتیں تمہارے لیئے حلال ہیں۔

اس آیت کے معنی کئی طرح پر کئے گئے ہیں۔ محصنہ کے معنی ہیں منکوحہ اور آزاد۔ ان دونوں معنوں کے لحاظ سے یہ معنی ہوں گے۔ اوّل جن عورتوں کے خاوند پہلے سے موجود ہیں، ان سے نکاح نہ کرو سوائے ان کے جو جنگ میں قیدی ہو کر ملک یمین کی حیثیت سے تمہارے قبضہ میں آئیں۔ (اس صورت میں پہلے خاوند سے طلاق کی ضرورت نہیں، بلکہ انہیں آزاد کر کے اُن سے نکاح کیا جا سکتا ہے) دوسرے یہ کہ منکوحہ عورتیں تم پر حرام ہیں سوائے اس کے کہ تم خود ان سے (پہلے خاوندوں کے طلاق کے بعد) نکاح کر لو۔ (کیونکہ یمین کے معنی نکاح کے بھی ہیں)۔ سوم آزاد عورتیں معاہدہ کی حد کے علاوہ تم پر حرام ہیں۔ (اس صورت میں یمین کے معنی معاہدہ کے ہیں۔ اور معاہدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان سے معاہدہ کیا ہے وہ چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح نہیں کرے گا) اور چہارم یہ کہ آزاد عورتیں تم پر حرام ہیں سوائے اس کے کہ وہ تمہارے نکاح میں آ چکی ہوں۔ (اس

صورت میں محصنٰت کے معنی آزاد اور ہیین کے معنی نکاح کے ہیں)۔
غرض کہ کوئی سے معنی بھی ہوں۔ بہرحال ان تمام عورتوں کو حرام قرار دیا
جو جائز طور پر رشتۂ نکاح میں منسلک نہ کی گئی ہوں اور اس طرح مغرب کے
موجودہ طریقۂ ازدواج کو ناجائز ٹھہرایا، جس میں عورت اور مرد، کسی مذہبی رسم
کے ادا کیے بغیر محض اپنی مرضی سے، خاوند اور بیوی کی طرح رہنے لگتے ہیں
متفق علیہ حدیث سے ثابت ہے کہ جن عورتوں سے نکاح بربنائے تعلق
خون حرام ہے، اُن ہی سے بربنائے رضاعت بھی حرام ہے۔ رضاعت سے
متعلق خود قرآن نے تصریح کر دی ہے۔ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ
كَامِلَيْنِ (البقرہ ۲=۲۳۳) کہ دو سال کی عمر کے اندر کسی بچے کو دودھ پلانا رضاعت
کی شرط کو پورا کر دیتا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ حرمت رضاعت صرف دودھ
پلانے سے متعین ہوگی، جہاں بچے کو بھوک کی حالت میں دودھ پلایا جائے محض
دو ایک گھونٹ پی لینا حرام نہیں کرتا (متفق علیہ)۔ ع۵

حاشیہ ع۵ یہاں ایک حدیث کا بیان ضروری ہے۔ مسلم (کتاب الرضاعۃ) میں حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابو حُذیفہ صحابی کی بیوی سہلہ بنت سُہیل نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ابو حُذیفہ کا غلام سالم بچپن سے گھر میں آتا جاتا ہے اور میں اس سے پردہ نہیں کرتی، لیکن وہ اب اس عمر کو پہنچ گیا ہے، جس عمر میں لوگ بالغ ہو جاتے ہیں اور جن باتوں کو مرد سمجھتے ہیں، وہ بھی اُنھیں سمجھنے لگا ہے اور وہ ہمارے پاس آتا جاتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ابو حُذیفہ پر اس کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تم اُسے دودھ پلا دو، اس کی محرم بن جاؤ گی اور ابو حذیفہ کے دل میں جو وسوسہ پیدا ہوتا ہے، وہ دور ہو جائے گا۔ اس کے کچھ دن بعد ابو حذیفہ کی بیوی نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے سالم کو اپنا دودھ پلا دیا ہے اور ابو حذیفہ کا وسوسہ جاتا رہا ہے۔"

اس حدیث کی بنا پر حضرت عائشہ رضؓ کا یہ مذہب تھا کہ اگر کسی بالغ کو بھی دودھ پلا دیا جائے تو رضاعت کی حرمت قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسری امّہات المومنین اور اُن کے تتبع میں آئمہ کی بھاری اکثریت نے اس واقعہ کو خاص ابو حذیفہ کی بیوی ہی سے متعلق قرار دیا ہے۔ اور اُسے عام اجازت تسلیم نہیں کیا۔

قرآن نے دو بہنوں کے اجتماع کی صراحت سے ممانعت کر دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ بھتیجی اور پھوپھی، اور بھانجی اور خالہ بھی نکاح میں جمع نہ کی جائیں (مسلم۔ کتاب النکاح) اور اس سے ایک عام اصول مستنبط ہوتا ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی دو عورتیں بیک وقت جمع نہیں کی جا سکتیں کہ اگر اُن میں سے ایک مرد ہوتی تو دوسری سے اس کا نکاح حرام ہوتا یعنی اگر ان دونوں کا رشتہ ایسا ہے کہ ایک کے مرد ہونے کی صورت میں نکاح حرام ہو جاتا تو وہ دونوں عورتیں ایک شخص کے نکاح میں بھی جمع نہیں ہو سکتیں۔

متعہ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام میں ایک مُعیّن مُدّت کے لیئے عارضی نکاح جائز ہے جیسا کہ ایران میں نکاح کی خاص صورت مرّوج ہے جسے نکاح متعہ کہتے ہیں یعنی مرد اور عورت بعض شرطوں کے تحت ایک مقررہ میعاد کے لیئے میاں بیوی کے طور پر رہتے ہیں اور اس میعاد کے ختم ہو جانے پر ان میں اپنے آپ علیحدگی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اس کے جواز میں قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت پیش کرتے ہیں:۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء ۴ : ۲۴)

پس تم ان عورتوں میں سے جس سے تمتع حاصل کرنا چاہو انھیں ان کے مقررشدہ مہر ادا کر دو۔

یہاں لفظ استمتاع کی موجودگی سے متعہ کے جواز پر دلیل قائم کی گئی ہے۔ حالانکہ اس آیت کے سیاق وسباق سے ثابت ہوتا ہے کہ ان الفاظ میں اس طرح کی کوئی اجازت نہیں۔ پہلے ان عورتوں کا ذکر کر کے جن سے کسی شخص کے لیئے نکاح کرنا حلال نہیں اور جنھیں اصطلاح شریعت میں محرّمات کہا جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ

ان عورتوں کے علاوہ (جن سے تمھارے لیئے

أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ۚ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ

(النساء ۴ = ۲۴)

نکاح کرنا حلال نہیں) تمام عورتیں تمھارے لیے حلال ہیں (ازدواجی زندگی کے) قید و بند میں رہنے کے لیے نہ کہ نفس پرستی کے لیے۔ اپنا مال خرچ کر کے ان سے نکاح کرو۔ پھر جن عورتوں سے تم نے (ازدواجی زندگی کا) فائدہ اٹھایا ہے تو چاہیے کہ جو مہر اُن کا مقرر ہوا ہے وہ ان کے حوالے کر دو اور تم پر اس سے متعلق کوئی گناہ نہیں جس پر تم مقرر کرنے کے بعد رضامند ہو جاؤ۔

اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان مندرجۂ صدر (آیت ۲۲ اور ۲۳) محرمات کے علاوہ جن عورتوں سے نکاح کا رشتہ استوار کرتے ہو تو ان کے مقررہ مہر بے کم و کاست ادا کرو۔ ہاں اگر ایک رقم مقرر کر لینے کے بعد تم اس میں کمی بیشی کرنا چاہو تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ تمھاری بیوی اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے آپ کلیتہً اس کی ادائی سے انکار کر دو یا اس میں ردّ و بدل کر لو۔ یہ تبدیلی، بیوی کی اجازت اور تصدیق کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔

ظاہر ہے کہ مدعا یہاں مہر کی اہمیت اور اس کی ادائی پر زور دینا ہے تاکہ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ مہر محض ایک رسم ہے جس پر چاہا تو عمل کیا، چاہا نہ کیا۔ متعہ کا جواز اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔

اسلام سے پہلے عرب میں متعہ کا رواج تھا اور بعض مواقع پر حالت اضطرار

میں رسول اللہ صلعم نے بھی اپنی زندگی میں اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن بعد میں آپ نے اسے حرام قرار دے دیا۔ سبرہ بن معبد سے روایت ہے کہ حضرت رسول کریم نے فتح مکہ کے دن عورتوں سے متعہ کی ممانعت کردی (مسلم۔ کتاب النکاح) اسکے مقابل پر حضرت علی کی روایت ہے۔ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن متعۃ النساء یوم خیبر وعن اکل لحوم الحمر الانسیۃ (متفق علیہ) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے کی ممانعت کردی لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ علی کی روایت کے کسی راوی سے غلطی ہوئی ہے۔ اس میں دو چیزوں کا ذکر ہے متعہ اور لحم حمر۔ یہاں یوم خیبر کے الفاظ متعہ کے ساتھ ہیں لیکن سفیان بن عیینہ کی روایت میں یہ لحوم الحمر کے ساتھ ہیں اِنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم لحوم الحمر یوم خیبر وحرم متعۃ النساء (مسند امام احمد) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن گدھے کا گوشت اور عورتوں سے متعہ کرنا حرام قرار دیا۔ یوں بھی فتح خیبر کے دن حرمت متعہ کا کوئی خاص موقع پیش نہیں آیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے بعد غزوہ اوطاس کے دوران میں متعہ کا ثبوت جابر بن عبداللہ اور سلمہ بن الاکوع کی روایتوں سے ثابت ہے (مسلم کتاب النکاح) یوں معلوم ہوتا ہے کہ فتح خیبر کے دن صرف گدھے کا گوشت حرام ہوا۔ حضرت علی نے (متعۃ النساء کا ذکر یونہی کر دیا تھا لیکن راوی نے غلطی سے لحوم الحمر کے ساتھ متعۃ النساء بھی شامل کر دیا۔ اس کی تائید حضرت جابر کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی یوم الخیبر لحوم الحمر الاھلیۃ واذن لحوم الخیل (متفق علیہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا اور گھوڑے کے گوشت کی اجازت

دی. حضرت جابرؓ ہی سے ایک دوسری روایت ترمذی میں ہے، جس میں وہ سب چیزیں گنوائی ہیں، جو یوم خیبر کو حرام قرار دی گئی تھیں۔ ان میں گدھے کے گوشت کا نام بھی ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ حضرت علی کی روایت میں یوم خیبر کا ذکر متعۃ النسا کے ساتھ سہو کا نتیجہ ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ اس کی حرمت کا فیصلہ دو مرتبہ ہوا۔ خیبر سے پہلے حلال تھا اور اس وقت حرام ہوا۔ پھر دوبارہ فتح مکہ کے دن حرام ہوا۔ لیکن غزوہ اوطاس میں تین دن کیلئے اس کی اجازت بھی احادیث سے ثابت ہے اور یہ غزوہ فتح مکہ سے بعد ہوا۔ لیکن فتح مکہ اور غزوہ اوطاس کے درمیان اتنا قلیل وقفہ ہے کہ اوطاس کے بعد کی حرمت کو بھی فتح مکہ کے دن ہی سے منسوب کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ غزوہ بہت معمولی اور غیر اہم ہے۔

بہرحال متعہ، فتح مکہ کے دن حرام ہوا ہو یا یوم خیبر کو، اس کی حرمت سے متعلق کوئی شبہ نہیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے خطبہ میں فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہوا کہ کسی شخص نے متعہ کیا ہے تو میں اس پر زنا کی حَد قائم کروں گا (مسلم۔ کتاب الحج) تمام صحابہ کا اس اعلان پر سر تسلیم خم کر دینا، اس امر کی صریح دلیل ہے کہ واقعی متعہ حرام ہو چکا تھا۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ لوگ حضرت عمرؓ کے اعلان پر اعتراض نہ کرتے کہ جب خدا اور اس کے رسول نے ایک چیز ہمارے لیے حلال کی ہے تو آپ کون ہوتے ہیں اس پر حَد لگانے والے۔

بعض لوگوں نے متعہ کے جواز میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت پیش کی ہے۔ فرمایا، انّھا تحل للمضطر کما تحل المیتۃ والدم و لحم الخنزیر یعنی متعہ حالتِ اضطرار میں اسی طرح حلال ہے، جس طرح حالتِ اضطرار میں مردار اور خون اور سؤر کا گوشت حلال ہے۔ اول تو ظاہر ہے کہ یہ حلت نہیں بلکہ حرمت کا فتویٰ ہے اور صحیح مسلم (کتاب النکاح) سے معلوم ہوتا

ہے کہ حضرت علیؓ نے ابن عباسؓ کی اتنی سی نرمی پر بھی انھیں متنبہ کیا اور صاف کہا کہ حضور علیہ السلام نے خیبر کے دن متعہ سے منع فرما دیا تھا۔ اور عروہ بن زبیر نے بھی اُنھیں ڈانٹا (مسلم۔ کتاب النکاح) غالباً حضرت عبداللہ بن عباس نے اسی کے بعد رجوع کیا جیسا کہ سعیدؓ بن جُبیر کی روایت سے ثابت ہے (مسند امام احمد)

لیکن اس بارے میں فیصلہ کن جواب حضرت عائشہ کا ہے۔ جب کچھ لوگوں نے بعض حدیثیں اس کے جواز میں اور دوسروں نے حرمت کی تائید میں پیش کیں تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ قرآن کی طرف کیوں رجوع نہیں کرتے اور یہ آیت پڑھی:۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ٥ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ٥ (المومنون ۲۳ = ۵-۶)	جو لوگ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے یا ان کے جن کے دہنے ہاتھ مالک ہوئے (یعنی لونڈیاں) انھیں کسی طرح کی ملامت نہیں۔

یعنی سوائے بیویوں، اور لونڈیوں کے کسی اور عورت سے تعلق زناشوئی پیدا کرنا جائز نہیں اور قابلِ ملامت ہے۔ ظاہر ہے متوعہ عورت نہ بیوی ہے نہ لونڈی۔ عـہ

عـہ ۔ یہاں ایک تاریخی واقعے کا ذکر بھی بے محل نہیں ہوگا۔

مامون الرشید بجا طور پر خاندان عباسیہ کا گل سرسبد کہلانے کا مستحق ہے۔ وہ شیعیت کی طرف مائل تھا۔ محمد بن منصور کی روایت ہے کہ ہم شام کے سفر میں مامون کے ساتھ تھے۔ مامون نے حکم دیا کہ منادی کردی جائے کہ متعہ حلال ہے۔ جب قاضی یحییٰ بن اکثم تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے ہم سے کہا کہ کل صبح سویرے مامون کے پاس جانا۔ اگر مناسب موقع دیکھو تو اس سے بات چیت کرنا، ورنہ خاموش رہنا حتیٰ کہ میں پہنچ جاؤں۔ چنانچہ ہم اگلے دن مامون کی مجلس میں پہنچے۔ وہ اس وقت مسواک کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ غصے میں کہتا جاتا تھا۔ متعتان کانتا علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ

(بقیہ حاشیہ ۶۷ پر ملاحظہ ہو)

اس کے علاوہ آیت محولۂ فوق (النساء ۴: ۲۴) میں احصان کے مقابلے پر
مسافحت کا ذکر کر کے صاف بتا دیا کہ دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو انسان

تھے، حضرت رسول کریم صلی اللہ
والہ وسلم وعلی عھد ابوبکر رضی اللہ عنہ وانا انھی عنھما (یعنی متعہ دو
علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں۔ میں دونوں کی ممانعت کرتا ہوں۔ یہ حضرت
عمر رضی اللہ عنہ کا قول بتایا جاتا ہے) لے جُعَل (جُعَل، ایک قسم کا کیڑا ہے۔ استعارۃً حقیر شے کو کہتے ہیں) تو کون
ہوتا ہے اس فعل سے ممانعت کرنے والا جس کی اجازت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ
نے دی ہے" (یہ خطاب حضرت عمر سے تھا) ہم نے جو دیکھا کہ مامون غضب ناک ہو رہا ہے تو ہم بولنے کی جرأت نہ کر سکے
اتنے میں قاضی یحییٰ بن اکثم بھی آن پہنچے اور بیٹھ گئے۔ مامون نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیوں کیا بات
ہے، آپ کے چہرے کا رنگ کیوں متغیر ہو رہا ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا "امیر المومنین! اسلام میں
جو نئی بات پیدا ہوئی ہے، اس کے غم میں۔" "اور نئی بات کیا ہوئی؟" منادی اعلان کر رہا ہے کہ زنا حلال
ہو گیا" "زنا"! "ہاں متعہ زنا ہی تو ہے"! "اس کی دلیل"؟ "دلیل! اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ
علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ
أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ
ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ۔ اے امیر المومنین! کیا متوعہ عورت ملک یمین (لونڈی) ہے؟"
مامون نے جواب دیا "نہیں"۔ "تو کیا وہ بیوی ہے جو خدا کے قانون کے مطابق خود وارث ہے اور اگر اس کے
پیچھے اولاد ہو تو دوسرے اس کے وارث ہوتے ہیں۔ اور کیا اس کے تمام حقوق بیوی کے سے ہیں؟" "نہیں"
"تو معلوم ہوا کہ متعہ ان دونوں حدود سے (جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں) متجاوز اور باہر ہے۔
اور ہی حدیث) تو اے امیر المومنین! زہری نے محمد بن الحنفیہ کے دونوں صاحبزادوں عبد اللہ اور
حسن سے اور محمد بن الحنفیہ نے اپنے والد ماجد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت
علی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں متعہ کی ممانعت اور اس کے حرام ہونے کا
اعلان کر دوں۔ حالانکہ اس سے پہلے اس کی اجازت تھی۔"
محمد بن منصور کہتے ہیں کہ اس پر مامون نے ہماری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ "کیا زہری
کی یہ حدیث محفوظ ہے؟" ہم نے جواب دیا ہاں یا امیر المومنین! اسے ایک بہت بڑی جماعت
نے روایت کیا ہے جن میں حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ بھی ہیں" اس پر مامون بولا:
"استغفر اللہ! اعلان کر دو کہ متعہ حرام ہے۔" اس پر منادی کر دی گئی۔ (وفیات الاعیان
لابن خلکان جزو ثالث حالات قاضی یحییٰ بن اکثم۔ مولانا شبلی نے بھی یہ واقعہ اپنی کتاب
"المامون" (ص ۲۱۳-۲۲۵) میں لکھا ہے)

نکاح کرکے اپنے آپ کو پابند بنانے یا پھر شہوت رانی کے لیئے آزاد رہے۔ اب دیکھ لیا جائے کہ متعہ ان میں سے کس صنف کے تحت آتا ہے۔ (۱) کیا متعہ کی میعاد کے اندر مرد، ممتوعہ عورت کو طلاق دے سکتا ہے؟ (۲) اور اس کے باوجود کیا وہ عورت سے اپنے حسب منشا طلاق کے بغیر قطع تعلق کرنے میں آزاد نہیں؟ (۳) کیا ممتوعہ عورت، منکوحہ بیوی کی طرح، مرد کی حالت میں عدتِ وفات کی پابند ہے؟ (کیا وہ متوفی کے ترکے میں وارث ہے؟ (۵) اور اگر وہ متعہ کی مدت کے اندر مر جائے تو کیا مرد اس کا وارث ہوگا؟ اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو معلوم ہوا متعہ میں نکاح شرعی کی کوئی خصوصیت بھی موجود نہیں۔ اور یہ لازماً مسافحت کے تحت آئے گا۔

نیز احصان کے مقابلے میں مسافحت کا ذکر، نکاح کی علت غائی پر روشنی ڈالتا ہے کہ نکاح کی غایت شہوت رانی کی آزادی نہیں بلکہ اس کے معنی خانہ داری کا جوا گلے میں ڈال کر زندگی بسر کرنا اور اس کے تمام نتائج کا ذمہ دار بننا ہیں۔

غرض اسلام کے نزدیک عارضی اور معینہ مدت کا نکاح جائز نہیں۔ اس میں صرف ایک ہی صورت کی اجازت ہے کہ عورت اور مرد، سوچ سمجھ کر رشتۂ ازدواج میں بندھنے پر تیار ہوں اور اس کی ساری ذمہ داریوں کو خوشی سے برداشت کریں نہ کہ ان سے بچاؤ کے لیئے حیلے تلاش کرنے کی سعی کریں۔

(۵)

تعدد ازواج اسلام نے بیک وقت چار نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ فرمایا:-

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا ۲ اگر تمھیں خوف ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے

فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا ؀

(النساء۴ : ۳)

کے معاملے میں انصاف نہیں کرسکوگے تو دوسری عورتوں میں جو تمھیں پسند آئیں بیک وقت دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کرلے سکتے ہو۔ اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہیں کرسکوگے تو پھر چاہیئے کہ ایک ہی سے کرو یا پھر جو عورتیں جنگ میں تمھارے ہاتھ لگیں ان سے نکاح کرلو۔ ناانصافی سے بچنے کے ایسا بہتر ہے۔

اس آیت کے معنی میں اختلاف ہے۔ ہم نے اوپر جو معنی بیان کیئے ہیں اس کی بنا یہ ہے کہ بعض یتیم لڑکیاں دوسروں کی پرورش میں تھیں اور ان کی کافی جائداد تھی۔ ان کے ولی چاہتے تھے کہ ان کے مال اور جمال کی وجہ سے ان سے نکاح کرلیں اس طرح لڑکی بھی گھر میں رہے گی اور مہر بھی تھوڑا مقرر کرسکیں گے۔ لیکن اس میں یہ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے، ان لڑکیوں سے اچھا سلوک نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کا ولی تو کوئی تھا نہیں جو خاوند سے بازپرس کرتا اور مہر کی قلیل رقم بدسلوکی اور طلاق کے راستہ میں حائل نہیں ہوسکتی تھی اس لیئے اجازت دی کہ اگر ایسی یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تمھیں ناانصافی کا اندیشہ ہو، تو تم دوسری عورتوں میں سے جو تمھیں پسند آئیں دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کرلو۔ اور اگر ان یتیم لڑکیوں سے نکاح کرتے ہو تو ان کا مہر پورا مقرر کرو۔ یہی معنی حضرت عائشہؓ سے بخاری اور مسلم میں مروی ہیں۔

حضرت امام شافعی نے آخری ٹکڑے الا تعولوا کے معنی کیئے ہیں "تاکہ

تمھارے عیال زیادہ نہ ہوں"۔ یہ بھی کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتے کیونکہ عول کے معنی لغت میں رغبت اور میل رکھنے کے ہیں۔ اسی لیئے انصاف اور عدل کے راستے سے ہٹ جانے کو عول کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے قدیم مفسروں نے بھی الا تعولوا کے معنی لا تمیلوا عن الحق (تم راہ حق سے ہٹ نہ جاؤ) کیئے ہیں اور یہی معنی اوپر اختیار کیئے گئے ہیں۔

بعض حضرات نے اس آیت سے نو یا اٹھارہ نکاح کی اجازت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسکی تغلیط اول تو تعامل سے ہوتی ہے۔ دوسرے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار ایسی تاویل کا مخالف ہے۔

عبد اللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ غیلان بن سلمہ ثقفی مسلمان ہوا اور اس کے نکاح میں ایام جاہلیت کی نو عورتیں تھیں وہ بھی مسلمان ہوگئیں۔ نبی کریم صلعم نے اس سے فرمایا۔ ان میں چار کو رکھ لو اور باقی کو علٰحدہ کردو۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

نوفل بن معاویہؓ کہتے ہیں کہ جب میں مسلمان ہوا تو میرے پاس پانچ عورتیں تھیں۔ میں نے رسول کریم صلعم سے پوچھا تو آپ نے فرمایا۔ ایک کو الگ کردو اور چار کو رہنے دو۔

اسی طرح عمرۃ الاسدی ایمان لائے تو ان کے نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں انھیں بھی چار سے زیادہ کی اجازت نہیں دی (ابن ماجہ)

ظاہر ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے اس آیت کے تحت چار کو حد قرار دیا ہے تو کوئی اور تاویل کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

رہا خود رسول کریم صلعم کا چار سے زیا نکاح کرنے کا سوال۔ تو یہ کوئی مناسب محل نہیں کہ اس پر تفصیل سے بحث کی جائے کیونکہ ان میں سے اکثر شادیاں دینی اور سیاسی اغراض کو مد نظر رکھ کے کی گئی تھیں۔ آپ اگر چاہتے تو آسانی سے دوشیزہ عورتوں

سے نکاح کر سکتے تھے، لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اُمّہات المومنین میں سے زیادہ تعداد ان کی تھی جو آپ کے نکاح سے پہلے ایک ایک اور دو دو بار بیوہ ہو چکی تھیں اور عمر میں بھی مرحلۂ شباب سے گذر چکی تھیں۔ اس لیئے ان سے شادی کسی نفسانی خواہش کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس سوال کا جواب کہ آیت زیر بحث کے نزول کے بعد جو چار سے زیادہ تھیں انھیں طلاق کیوں نہیں دی گئی، یہ ہے کہ اوّل تو ازواج النبیؐ کا احترام اور تقدس اس امر کا مقتضی تھا کہ اُنھیں اس رشتے سے خارج نہ کیا جائے۔ دوسرے خود اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر کہ

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ۝ (الاحزاب ۳۳ : ۵۲)	اس کے بعد تمھارے لیئے (مزید) عورتیں نکاح میں لانا جائز نہیں اور نہ یہ کہ ان کی جگہ دوسری بیویاں نکاح میں لاؤ خواہ ان کا حُسن تمھیں پسندیدہ ہی کیوں نہ ہو۔ سوائے اُن کے جن تیرا دست راست مالک ہو چکا اور اللہ ہر چیز پر نگراں ہے۔

چار سے زائد بیویوں کو حلال قرار دے دیا ہے۔ ہاں مزید نکاح کرنے سے روکا اور یہ بھی کہہ دیا کہ ان میں سے کسی کو طلاق دے کر بھی تم ایسا نہیں کر سکتے۔

تعدّدِ ازدواج کی شروط

لیکن تعدّدِ ازدواج کی اجازت مشروط ہے اور صرف خاص حالتوں کے تحت ہی اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک تو سورۂ نساء کی اس آیت میں بیان کر دی کہ اگر تمھیں ان یتیم لڑکیوں سے ناانصافی کا ڈر ہو تو ایسا کر سکتے ہو۔ پھر اس اجازت پر

ایک اور پابندی کا اضافہ کیا کہ بیویوں کے درمیان عدل کرو یعنی اُن کی ضروریات کے مہیا کرنے میں، کھانے کپڑے میں، ان سے تعلقات میں، عدل قائم کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ایک کے گھر میں جشن ہو تو دوسری کے گھر فاقہ۔ ایک جگہ شب عید ہو تو دوسری کے دیئے میں تیل بھی نہ ہو۔ عورت کی فطرت میں خدا نے رشک وحسد کا مادہ بہت زیادہ رکھا ہے۔ عام حالات میں وہ دوسری عورت تو درکنار، بیچ کی مکھی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ پس جہاں سوت کا معاملہ ہو وہاں مرد کو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنی تمام بیویوں کو ہر ایک چیز ایک سی دے۔ مکان۔ سامان۔ کپڑے۔ زیورات۔ خوراک اور دیگر ضروریات کی اشیاء سب ایک سی ہوں۔ ان کے یہاں اپنے آنے جانے کا بھی ایک اصول بنالے۔ رسول کریم صلعم کا اُسوۂ حسنہ تو اس باب میں اتنا وسیع تھا کہ وہ بیویوں کے جذبات تک کا خیال رکھتے تھے اور حتی الوسع انھیں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے۔ بخاری (کتاب المظالم) میں ہے کہ ایک روز آپ کسی بیوی کے یہاں تھے۔ وہاں کسی دوسری بیوی نے کھانے کی کوئی چیز آپ کی خدمت میں بھیجی۔ جس بیوی کی باری تھی اور جس کے یہاں آپ تشریف فرما تھے، انھوں نے اس کو بُرا مانا اور جھنجلا کر ہاتھ جو ہاتھ جو مارا تو سوء اتفاق سے کھانے کا برتن زمین پر گر گیا اور ٹوٹ گیا۔ آپ نے ٹوٹے ہوئے پیالے کے ٹکڑے جوڑ کر ملائے اور اس میں کھانا رکھا اور فرمایا۔ کھاؤ۔ اور قاصد کو بھی اتنی دیر تک روکے رکھا تاکہ وہ واپس جاکر کھانا بھیجنے والی بیوی سے واقعہ پورا پورا اور درست بیان کر سکے۔ جب کھانا ختم کر چکے تو شکستہ پیالہ رکھ لیا اور اس کی جگہ ثابت پیالہ واپس بھیجا ع

حاشیہ ع بخاری میں ناموں کی تصریح نہیں لیکن ابوداؤد (کتاب البیوع) اور نسائی (کتاب العشرۃ النساء) سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرت عائشہ رضؓ کے گھر میں تھے اور کھانا حضرت صفیہ رضؓ نے بھیجا تھا۔

نیز حکم دیا کہ اگر تم ان ظاہری معاملات اور تعلقات میں عدل نہیں کر سکتے تو اس سے یہ بہتر ہے کہ تم ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا خیال ہی نہ کرو بعض لوگوں نے اس آیت کو "لَنْ تَسْتَطِيعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ" (النساء ۴ - ۱۲۹) سے ملا کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ انسان اگر چاہے، تو بھی عورتوں کے بارے میں عدل نہیں کر سکتا۔ اس لیئے اسے کسی حالت میں بھی ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں اور یہ چار نکاح والی آیت اس دوسری آیت سے منسوخ ہے۔ مسئلہ نسخ پر بحث کا تو یہ کوئی موقع نہیں لیکن غور کا مقام ہے کہ اگر دوسری آیت کے وہی معنیٰ ہیں جو یک زوجیت کے حامی حضرات کرتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورت میں آخر ایسی اجازت دینے کی ضرورت ہی کیا پیش آئی تھی جس پر عمل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں سے یہ نتیجہ نکالنا غلطی ہے۔ جہاں دوسری جگہ فرمایا کہ اگر تم چاہو تو بھی عورتوں کے بارے میں عدل نہیں کر سکتے تو وہ محبت و جذبات سے متعلق ہے نہ کہ ظاہری تعلقات کے لیئے۔ یہ عام مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ انسان نان و نفقہ اور ظاہری میل جول میں تو انصاف اور عدل کر سکتا ہے، لیکن اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تمام بیویوں سے محبت اور رغبت بھی ایک سی رکھے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کی باری مقرر فرماتے اور عدل کرتے اور فرمایا کرتے یا اللہ! میں نے جو باریاں مقرر کی ہیں یہ میری تقسیم ہے اس چیز میں جس کا میں مالک ہوں۔ اور جس چیز کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں، اس چیز پر تو مجھ کو ملامت نہ کر۔ (ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ) رسول کریم صلعم کی زندگی سے ثابت ہے کہ انھیں ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہؓ صدیقہ سے سب سے زیادہ محبت تھی

اس امر کا ثبوت کہ آیت "لَنْ تَسْتَطِیْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا" میں محبت ہی کا ذکر ہے اسی آیت کے آخری ٹکڑے سے بھی ملتا ہے۔ فرمایا:۔

فَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ	پس ایسا نہ کرو کہ کسی ایک ہی کی طرف
فَتَذَرُوْھَا کَالْمُعَلَّقَۃِ۔	بالکل جھک جاؤ اور دوسری کو اس طرح
(النساء ۴ = ۲۹)	چھوڑ بیٹھو کہ وہ معلق ہو کر رہ جائے

یعنی نہ تو وہ غریب آزاد ہے کہ اپنا کوئی اور انتظام کرلے اور نہ شوہر ہی اس کے حقوق ادا کرتا ہے۔ وہ بے چاری ادھر میں لٹک رہی ہے۔ عیاں ہے کہ میدان طبع میں انسان کو مجبور مان کر اسے یہ ہدایت کی ہے کہ تم ایک بیوی کو دوسری پر اس حد تک ترجیح نہ دو کہ اس سے کلی طور پر بے پروا ہو جاؤ۔

لیکن اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً کہہ کر یہ بھی بتا دیا کہ اصولاً ایک ہی بیوی چاہیئے زیادہ کی اجازت محض ضرورت کے لیئے ہے۔ اور وہ بھی عدل کی شرط کے ساتھ۔ بہرحال بعض حالات میں تعدد ازواج کی اجازت ہے۔ یہ حکم نہیں کہ اس کی تعمیل لازم ہو۔ دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے بھی تعدد ازواج کی ممانعت نہیں کی اگرچہ ان کے یہاں بھی ایک بیوی کی فضیلت کا بیان ہے اس کے علاوہ اقوام عالم کے متعدد برگزیدہ اور محترم بزرگوں اور نبیوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کرکے یہ ثابت کردیا کہ تعدد ازواج نہ قابل اعتراض ہے نہ روحانی ترقی کے منافی۔

لونڈی سے نکاح آیت کا آخری ٹکڑا ہے:۔

اَوْ مَا مَلَکَتْ	یا پھر جو عورتیں جنگ میں تمھارے ہاتھ آگئی
اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ	ہیں (ان سے نکاح کرلو) بے انصافی سے بچنے
اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا۔	کے لیئے ایسا کرنا زیادہ قرینِ صواب ہے بالمقابلہ
(النساء ۴ = ۳)	اس کے کہ یتیم لڑکیوں سے ظلم کرکے اللہ کے حضور جوابدہ ہو

یعنی اگر تم آزاد مومنہ عورتوں سے شادی کرنے کا مقدور نہیں رکھتے تو جنگ میں اسیر شدہ عورتوں سے جو لونڈیاں بن کر تمھارے قبضے میں آگئی ہیں، نکاح کرسکتے ہو۔ البتہ یہ شرط ہے کہ وہ مشرکہ نہ ہوں اور اُنھوں نے اسلام قبول کرلیا ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسی لونڈیوں سے باقاعدہ نکاح کی ضرورت نہیں۔ انھیں نکاح کے بغیر ہی بیوی کی طرح رکھ لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ معنی قرآن اور خود سُنّت رسول اللہ صلعم کے خلاف ہیں۔ اسی سورۂ نسار میں آگے چل کر حکم ہوتا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا	اور اگر تم میں سے کسی کو استطاعت
اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ	نہ ہو کہ وہ آزاد مومنہ عورتوں سے
فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ	نکاح کرسکے تو وہ ان مومنہ لونڈیوں سے
مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ	(نکاح کرلے) جو (جنگ میں اسیر ہو کر) تمھارے
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ	قبضے میں آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمھارے
بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ	ایمانوں کی نسبت بہتر جانتا ہے اور تم
(النساء ۴ - ۲۵)	سب ایک دوسرے کی جنس ہو۔

یہ حکم اس لیئے دیا کہ محض اس وجہ سے کہ یہ عورتیں اپنی شامتِ اعمال سے قیدی ہو کر تمھارے قبضے میں آگئی ہیں، تم ان سے نفرت نہ کرو اور انھیں اپنے نکاح میں لے لو۔ اول تو جیسا کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا ہے لونڈی غلام تمھارے بھائی بند ہیں (مسلم۔ کتاب الایمان) اس لیئے اُنھیں ذلیل اور کم مرتبہ سمجھنا درست نہیں۔ پھر ممکن ہے کہ آزاد عورت بلحاظ ایمان و تقویٰ ایک لونڈی سے کم درجہ ہو خود حضرت رسول کریمؐ نے حضرت صفیہؓ سے جو مذہبًا یہودیہ تھیں اور غزوۂ خیبر میں اسیر ہو کر آئی تھیں اور حضرت جویریہؓ سے جو بنی مصطلق کے امیر حارث کی بیٹی اور غزوۂ مصطلق میں قید ہوئی تھیں، نکاح کیا

لونڈیوں سے نکاح کی شرائط بھی بیان کر دیں۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ	اُنھیں ان کے سرپرستوں کی اجازت
اَهْلِهِنَّ وَ آتُوْهُنَّ	سے اپنے نکاح میں لاؤ اور دستور کے
اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ	مطابق ان کے مہران کے حوالے کر دو،
مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ	البتہ ازدواجی زندگی کے قید و بند میں
وَّلَا مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ	میں رہنے والی ہوں۔ بدکار نہ ہوں
فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ	اور نہ ایسی کہ چوری چھپے بد چلنی کرتی
اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ	ہوں۔ پھر اگر (نکاح کے بعد وہ) بد چلنی
فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا	کی مرتکب ہوں تو اُن کے لیے آزاد
عَلَى الْمُحْصَنَاتِ	عورتوں سے نصف سزا ہو گی۔ یہ
مِنَ الْعَذَابِ ذَالِكَ	اجازت ان کے لیے ہے جنھیں اندیشہ
لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ	ہو کہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں وہ
مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا	نقصان اور برائی میں پڑ جائیں گے۔
خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللّٰهُ	ہاں اگر تم صبر کرو تو تمھارے لیے بہتر
غَفُوْرٌ الرَّحِيْمٌ ۝	ہے۔ اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے
(النساء ۴ = ۲۵)	والا ہے۔

گویا اوّل ان کے مالک کی اجازت ہو دوم اُنھیں بھی مہر دو۔ ہاں ظاہر ہے کہ ان کا مہر آزاد عورت سے نسبتاً کم ہو گا۔ اگر خود مالک ہی اس سے نکاح کرلے تو وہ بغیر مہر کے بھی ایسا کر لے سکتا ہے کیونکہ لونڈی اس کی ملکیت ہے۔ لونڈی کی آزادی ہی اس کا مہر ہو گی جیسے کہ خود حضرت رسول کریمؐ نے حضرت صفیہ بنت حیؓ کے معاملہ میں کیا (مسلم۔ کتاب النکاح) سوم لونڈی مومنہ

اور پاک دامن ہو۔ چہارم لونڈی سے نکاح کی اجازت اس صورت میں ہے کہ آزاد عورت سے نکاح میسر نہ ہو اور نکاح کے بغیر تندرستی خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو یا بری صحبت میں پڑ کر اخلاق تباہ ہو جانے کا ڈر ہو۔

آیت مندرجہ صدر کے آخری الفاظ سے کہ "اگر تم صبر و انتظار کرو تو بہتر ہے کیونکہ ممکن ہے کہ تمھاری حالت سدھر جائے اور تم کسی آزاد عورت سے شادی کرنے کے قابل ہو جاؤ" بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نہیں چاہتا کہ لونڈیوں سے نکاح کیا جائے۔ تو یہ درست ہے کہ قرآن لونڈی سے لونڈی کی حیثیت میں رہتے ہوئے نکاح کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فسق و فجور کی زندگی پسند کرتا ہے بلکہ اُس نے "لَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ" (النور ۲۴ - ۳۳) کہہ کر انھیں زنا پر مجبور کرنے سے منع کیا ہے۔ اور نکاح کے بغیر تعلقات زناشوئی قائم کرنا زنا ہے۔ انھیں یونہی آزاد چھوڑ دینا اور اُن کا نکاح نہ کرنا بھی بالواسطہ انھیں فسق و فجور کی طرف مائل پر مجبور کرنے سے کم نہیں۔ اسی لیئے دوسری جگہ کہا کہ لونڈیوں کا نکاح صالح غلاموں سے کر دو۔ وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ (النور ۲۴ = ۳۲) اور جو تم میں سے مجرد عورتیں یا مرد ہیں، ان کے نکاح کر دو اور اپنے صالح غلاموں اور لونڈیوں کے بھی نکاح کر دو۔ قرآن کریم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ خاص ضرورت کے بغیر آزاد مردوں کا نکاح لونڈیوں سے نہ ہو کیونکہ اس سے اولاد کے اخلاق پر ناپسندیدہ اثر پڑنے کا احتمال ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ کہہ کر یہ بتا دیا کہ در اصل تم سب ایک نسلِ انسانی سے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ تم اُنھیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لو تاکہ دونوں ایک سطح پر آجاؤ۔ چنانچہ

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے حضرت رسول کریم صلعم کا یہی دستور تھا۔ اسلام چاہتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں کی وقعت اور عزت اور معاشری درجہ بھی بڑھے۔ اسی لیئے حدیث میں فرمایا کہ انھیں تعلیم دو۔ آداب سکھاؤ اور آزاد کر کے ان سے نکاح کرو۔ (بخاری۔ کتاب العلم) عــ۵

(۶)

بیوی کو دیکھنا

نکاح کے لیئے سب سے پہلے یہ شرط لگائی کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کو دیکھ کر پسند کریں

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء ۴ = ۳) ایسی عورتوں سے نکاح کرو، جو تمھیں پسند ہوں۔

پسند یا ناپسند کا فیصلہ عورت کو دیکھے بغیر ممکن نہیں اور جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے، مرد عورت کو اس کی رضامندی سے ہی دیکھ سکتا ہے۔ گویا نہ صرف

حاشیہ عــ۵ جو لوگ اس خیال سے لونڈیوں کو آزاد کر کے ان شادی نہیں کرتے کہ اس سے ان کی عالی خاندانی پر حرف آئے گا۔ ان کے لیئے اسوۂ رسول کریم میں سامانِ بصیرت ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک اعلیٰ خاندان کے مرد کے لیئے آزاد شدہ لونڈی سے نکاح کرنے میں زیادہ عار ہونا چاہیئے یا ایک عالی خاندان کی عورت کے لیئے ایک آزاد شدہ غلام سے نکاح کرنے میں ظاہر ہے کہ عورت کے لیئے زیادہ عار کی بات ہے۔ لیکن خود رسول کریم صلعم نے آزاد شدہ لونڈیوں سے نکاح کر کے اور اپنی پھوپھی کی بیٹی حضرت زینب بنت جحش کا نکاح آپ نے آزاد کردہ غلام زید بن حارث سے کر کے بتا دیا کہ نہ وہ موجب عار ہے نہ یہ۔ اسلام قومی تفرقات کو یکسر مٹا دینا چاہتا ہے۔ اس کی نظر میں وقعت بڑھانے والی چیز خاندان یا حسب و نسب نہیں بلکہ نیکی اور تقویٰ ہے۔ اسی لیئے فرمایا "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات ۴۹ = ۱۳) تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے مقرب وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ اور ایمان اور اتقا سے متعلق انسان کیا فیصلہ دے سکتا ہے۔ خود ہی فرمایا: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ (النساء ۴ = ۲۵) اور تمھارے ایمان کے بارے میں صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ ممکن ہے جسے ہم ایمان میں کم درجہ خیال کرتے ہیں، وہی بارگاہِ الٰہی میں زیادہ مقرب ہو۔ آپ بھی فرماتے ہیں کہ تم میں سے بہتر وہی ہے جو اخلاق کے اعتبار سے اچھا ہے۔ (بخاری)

مرد ہی عورت کو دیکھے بلکہ عورت کو بھی مرد کے دیکھنے کی اجازت ہے۔
ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں فلاں انصاری عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم نے اُسے دیکھ لیا ہے۔ اس نے جواب دیا نہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا، جاؤ، ایک نظر اُسے دیکھ لو بعض دفعہ انصاری عورتوں کی آنکھوں میں خرابی پائی جاتی ہے (مسلم۔ کتاب النکاح) ان ہی معنوں کی ایک اور حدیث مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے، جس کے آخر میں آپ نے فرمایا کہ تم اُسے ایک نظر دیکھ لو، کیونکہ جن دو میں محبت پیدا کی جائے گی تو انھیں آپس میں دیکھ لینا چاہیئے (نسائی۔ ترمذی)

ترجیح اور پسندیدگی کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مومن کا فرض ہے کہ وہ ہر حال میں دین کو دنیا پر مقدم رکھے۔ حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ لوگ کسی عورت سے چار باتوں کی وجہ سے نکاح کرتے ہیں۔ مال، حسب ونسب، حسن اور دینداری تم دینداری کو ترجیح دو (متفق علیہ)

دوسری بات جو اس آیت سے مستنبط ہوتی ہے، وہ عمر کا سوال ہے۔ جب ایک مرد یا عورت اس قابل ہی نہیں کہ وہ نکاح کی اہمیت کا اندازہ لگا سکے تو وہ پسندیدگی کا اظہار کیا کریں گے۔ دوسری جگہ جہاں یتامیٰ کے اموال ان کے حوالے کر دینے کا ذکر کیا ہے تو کہا۔ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (النساء ۴ = ۶) جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ یہاں بلوغ اور نکاح کو مترادف قرار دیا ہے۔ گویا نکاح کی صحیح عمر بلوغ ہے اور اس سے پہلے نکاح کر لینا مناسب نہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کی رو سے صغر سنی کی شادی ناجائز یا ممنوع ہے۔ جہاں عدت کے احکام بیان کیے ہیں وہاں ان عورتوں سے متعلق بھی حکم دیا جن کے

ایام ماہواری شروع ہی نہیں ہوئے (الطلاق ۶۵ = ۴) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نابالغ اور کم سن لڑکیوں کی شادی ناجائز نہیں قرار دیتا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نکاح کیا ہے تو ان کی عمر سات برس سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن جائز اور بات ہے اور مناسب اور۔ بعض اوقات ایسی مجبوریاں پیدا ہو جاتی ہیں کم سن لڑکی کا نکاح کر دینا ہی اس کی بہتری کا واحد ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیئے ایسے حالات کے لیئے اجازت دے دی ورنہ مشکل پیدا ہو جاتی۔ البتہ عام حالات میں کم سنی کی شادی غیر مناسب ہے اور اس سے اجتناب لازم ہے۔

مشرک اور کافر سے نکاح

لیکن مرد اور عورت کی اس باہمی پسندیدگی پر ایک قید لگا دی۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ۔

(البقرہ ۲ = ۲۲۱)

اور مشرکہ عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، نکاح نہ کرو۔ ایک مشرکہ عورت تمھیں بظاہر کتنی ہی پسند آئے لیکن مومنہ عورت اس سے کہیں بہتر ہے۔ اسی طرح مشرک مرد جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں مومنہ عورتیں ان کے نکاح میں نہ دی جائیں۔ مومن ایک مشرک سے بہتر ہے اگرچہ بظاہر مشرک مرد تمھیں کتنا ہی پسند آئے۔

اور یہ حکم بلا وجہ نہیں دیا بلکہ اس کی وجہ یہ ظاہر کی کہ "اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ"۔ یہ مشرک تمھیں راہِ حق سے برگشتہ کر کے دوزخ کی طرف لے جانے

والے ہیں۔

شرک کے اقسام قرآن کے مختلف مقامات پر شرک کی کئی اقسام کا بیان ہے۔ مثال کے طور پر چند ایک یہ ہیں:-

۱۔ اللہ تعالیٰ کا اور ہمسر ٹھہرانا (البقرہ ۲ = ۲۲)

اس کی مثال میں ایک حدیث بیان کی جا سکتی ہے۔ ایک شخص نے حضرت رسول کریم صلعم سے کہا۔ ماشاء اللہ وشئت جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔ اس پر آپ فرمایا "جعلتنی للہِ نِدًّا" کیا تم مجھے اللہ کا ہم سر بناتے ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں کسی اور کو بھی اس کا شریک اور معبود ٹھہرانا (آل عمران ۳ = ۶۳)

زرد شتی مذہب کے پیرو، خیر اور شر کے دو خداؤں' یزدان اور اہرمن' کو مانتے ہیں۔ عیسائی (اور ان کے تتبع میں بعض مسلمان بھی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بعض صفاتِ خداوندی مثلاً احیاء موتی، خلق وغیرہ سے متصف کرتے ہیں۔ سناتن دھرمی بعض برگزیدگان کو خدا کے اوتار قرار دیتے ہیں۔ آریہ سماجی اور دوسرے ہندو بھی روح اور مادّہ کو خدا کی طرح ازلی، ابدی اور غیر مخلوق مانتے ہیں۔ بعض مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ حضرت رسول کریم صلعم عالم الغیب تھے۔ یہ سب اعتقادات اس آیت کی رو سے شرک ہیں۔ بتوں، قبروں اور پیروں کے سامنے سجدہ کرنا بھی، اس آیت کے تحت شرک ہے۔

۳۔ خدا کے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کرنا (الانعام ۶ = ۱۰۱)

عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ کفارِ عرب،

فرشتوں کو بنات اللہ کہتے تھے۔ یہ دونوں عقیدے مشرکانہ ہیں۔

۴۔ اللہ کے سوا کسی اور کو حاجت روائی کے لئے پکارنا (یونس ۱۰ = ۶۶)

بعض بزرگوں اور اولیاء اللہ کو حرف ندا سے پکارنا اور ان سے ایسی مدد اور حاجت روائی کی درخواست کرنا، جو صرف خدائے قادر مطلق کے اختیار میں ہے، قرآن کی رو سے شرک ہے۔

۵۔ کسی خواہش یا جذبے کا اس حد تک پابند ہو جانا کہ انسان اس اس کی موجودگی میں اور سب کچھ بھول جائے (الفرقان ۲۵ = ۴۵) نیز (الجاشیہ ۴۵ = ۴۳)

اور بھی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ یہ سب باتیں انسان کو اس کے بلند مرتبے سے گرانے والی ہیں۔ اس لیئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور جو چاہے معاف کر دے، شرک کبھی معاف نہیں کرتا۔ (النساء ۴ = ۴۸)

تعلیم اسلام ہر طرح کے شرک سے پاک ہے۔ اس کے نزدیک خدا ایک ہے۔ دو یا تین نہیں۔ وہ بے نیاز ہے۔ اس کو دنیا کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیئے کسی سہارے یا معاون کی ضرورت نہیں۔ مادّہ اور روح بھی اسی طرح اس کی مخلوق ہیں جیسے دوسری تمام اشیاء، نہ وہ خود کسی کا بیٹا ہے نہ اور کوئی اس کا بیٹا۔ حضرت مسیح اور رام اور کرشن، سب اس کے رسول ہیں اور اس کے بندے۔ اور کوئی اس کا ہم سر نہیں نہ صفات میں نہ افعال میں (سورۃ الاخلاص)

پس قرآن کی رو سے شرک صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی اور کی عبادت کی جائے بلکہ جیسا کہ حضرت رسول کریم صلعم نے فرمایا ہے، شرک ہمارے اعمال میں نہایت باریک راہوں سے داخل ہو سکتا

ہے۔ اسلام نے توحید پر اس قدر زور دیا کہ نہ صرف معتقدات میں بلکہ اعمال میں بھی ان تمام اشیا سے اجتناب کا حکم دیا جو شرک سے ملوث ہیں۔ یہاں تک کہ ان چیزوں کے کھانے سے بھی منع فرمایا جن پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اسی لیئے یہاں فرمایا کہ تم ان لوگوں سے نکاح نہ کرو، جو مشرک ہیں۔ کیونکہ اس سے اولاد پست حوصلہ اور بزدل پیدا ہوگی

قرآن کے کئی مقامات پر شرک کے بُرے نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (الحج ۲۲ = ۳۱)

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا وہ گویا بلندی سے نیچے آگرا۔

انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہے۔ انسان کو اس پر حاکم مقرر کیا۔ لیکن اگر وہ اپنی نادانی سے انھیں چیزوں کے آگے سجدے کرنے لگے اور انھیں اپنے اوپر مسلط کرے تو اس سے بڑھ کر اور ذلت کیا ہو سکتی ہے۔

مشرک بزدل اور ڈرپوک ہوتا ہے۔ چونکہ موحد کا بھروسہ اور تکیہ محض اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے اس لیئے وہ ماسوی اللہ سے نہیں ڈرتا۔ اس میں تہوّر اور جرأت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے، یہ سب میری فرمانبرداری اور مدد کے لیئے ہے۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (الجاثیہ ۴۵ = ۱۳) زمین اور آسمان کی سب چیزیں تمھارے ماتحت کی گئی ہیں۔ سائنس کی جدید ترقیاں اس دعوی کی صداقت کی شاہد ہیں اور نہ معلوم ابھی مستقبل کے پردے میں اور کیا کچھ پوشیدہ ہے۔ مومن کو یقین ہوتا ہے کہ دنیا میرے لیئے ہے۔ اس لیئے میرا

خدا مجھے تمام شر و آفات سے بچائے گا۔ اس کے برخلاف مشرک ہر ایک چیز سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے۔

بلکہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ مشرک کے تمام اعمال ہی تباہ ہو جاتے ہیں۔

لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر ۹ - ۶۵)
اگر تم نے شرک کیا تو گویا تمہارے تمام اعمال ضائع ہو گئے۔

کیونکہ اس کے اعمال کا مقصود اصلی اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں بلکہ دنیا ہوتی ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی کوشش کے نتیجہ میں دنیا میں تو کامیاب ہو جائے لیکن آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (ھود ۱۱ - ۱۵ - ۱۶)

جو لوگ دنیا اور اس کا مال و اسباب چاہتے ہیں ہم انھیں ان کے اعمال (کا بدلہ) پورا پورا اسی دنیا میں دیتے ہیں اور وہ کسی نقصان میں نہیں رہتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوائے اور کچھ نہیں۔ انھوں نے جو کچھ اس دنیا میں کیا، وہ ضائع ہو گیا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب بے کار ہے۔

یہی اسباب ہیں جن کو مد نظر رکھ کر مشرکوں سے نکاح منع کر دیا۔ کیونکہ والدین کے اعتقاد و اعمال اوضاع و اطوار کا بہت گہرا اثر اولاد کی زندگی پر پڑتا ہے۔ اس لیے آئندہ کی خرابیوں کا سد باب کرنے کے لیے جڑ ہی کاٹ دی۔

دوسری جگہ حکم دیا کہ کافروں سے مسلمہ عورت کا نکاح جائز نہیں۔

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ۔ (الممتحنہ ۶۰ = ۱۰)

نہ وہ (مومنہ) عورتیں ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) مرد اُن (مومنہ) عورتوں کے لیے حلال ہیں۔

اگرچہ مشرکوں اور کافروں کے ساتھ مسلمان مردوں اور عورتوں کا نکاح ناجائز قرار دیا ہے لیکن اہلِ کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا اور ان کے ساتھ مسلمان مردوں کے نکاح کی اجازت دی ہے۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (المائدہ ۵ = ۵)

ان لوگوں کی عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے (تم پر حلال ہیں) بشرطیکہ ان کے مہر ان کے حوالے کردو۔ اور مقصود نکاح ہو نہ کہ بدکاری۔

ایک مسلم مرد کا اہل کتاب کی عورت سے نکاح جائز ہے۔ لیکن ایک مسلمہ عورت کا ایسا نکاح بھی جائز نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک اہل کتاب کے عقائد مشرکانہ ہوں اس صورت میں ایسی عورت سے بھی نکاح ناجائز ہے کیونکہ مشرکہ سے نکاح کی بہر حال ممانعت ہے۔ ع۵

حاشیہ ع۵ یہ بھی ایک دلچسپ سوال ہے کہ اہل کتاب کون ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن میں یہ لفظ صرف یہود اور نصاریٰ سے متعلق بولا گیا ہے۔ کیونکہ نزولِ قرآن کے وقت یہی دو قومیں زیادہ مشہور اور جزیرۃ العرب سے قربِ مکانی کی وجہ سے زیادہ تر مخاطب بھی تھیں۔ لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہم نے دنیا کی تمام قوموں میں نبی اور رسول بھیجے ہیں۔

اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ (فاطر ۳۵ = ۲۴)

کوئی ایسی قوم نہیں جس میں گناہوں کی پاداش میں خدا کے غضب سے ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۱۰ = ۴۷)

اور دنیا کی ہر ایک قوم میں خدا کی طرف سے صاحبِ شریعت رسول آئے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ تمام قومیں اہل کتاب ہیں۔ قرآن خود کہتا ہے کہ میں نے بہت سے نبیوں کا ذکر نہیں کیا (النساء ۴ = ۱۶۴) لیکن اس کے باوجود وہ یہود و نصاریٰ اور کفارِ عرب کے ساتھ ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۶ پر ملاحظہ ہو)

لیکن اگر ایک غیر مسلمہ کتابیہ اور مسلمہ کے درمیان انتخاب کا سوال ہو، تو پھر مسلمہ کو ترجیح دینا چاہیئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے، کہ اگر تم کو اہلِ کتاب کے علاوہ برتن ملتے ہوں، تو اُن کے برتنوں میں نہ کھاؤ، ورنہ کھالو (بخاری) دوسری جگہ فرمایا کہ کسی عورت کے نکاح میں چار چیزوں کو وجہ ترجیح قرار دیا جاسکتا ہے۔ مال، خاندان، حسن اور دین داری۔ تم دین داری کو کا انتخاب کرو (متفق علیہ)

ولایتِ نکاح

قرآن میں جہاں کہیں مرد کے نکاح کا ذکر ہوا ہے وہاں نَکَحَ، یَنْکِحُ کے صیغے استعمال ہوئے ہیں جس کے معنی ہیں اُس نے نکاح کیا مثلاً لَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکَاتِ (البقرہ ۲ = ۲۲۱) مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ دوسری جگہ لونڈیوں سے متعلق فرمایا:۔ فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ (النساء ۴ = ۲۵) ان سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے نکاح کرلو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد اپنے نکاح میں خود مختار ہے اور وہ اپنی مرضی سے اپنا نکاح کرلے سکتا ہے۔ لیکن اس کے بالعکس جہاں عورتوں کے نکاح کا ذکر ہے وہاں اِنْکَاحٌ (بابِ افعال) کے صیغے استعمال ہوئے ہیں وَلَا تُنْکِحُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَتّٰی یُؤْمِنُوْا (البقرہ ۲ = ۲۲۱) اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵

مشرکوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قوموں میں رسول آئے اور جنھیں کتاب دی گئی تھی وہ بھی مشرکانہ عقائد اور اعمال کی وجہ سے مشرک کہلانے کی مستحق ہیں۔ مثلاً عیسائیوں کو قرآن میں اہل کتاب کہا ہے، لیکن ان کے الوہیت مسیح و ابنیت مسیح کے عقیدوں کو شرک قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے انھیں مشرک کہا ہے۔ پس اہل کتاب تو دنیا کی ہر قوم ہے لیکن شرک کا فیصلہ اس کے موجودہ عقیدے اور عمل سے مستنبط ہوگا۔

وہ ایمان نہ لے آئیں یا وَ اَنْکِحُوا الْاَیَامیٰ مِنْکُمْ (النور ۲۲-۳۲)
اس سے استنباط ہوتا ہے کہ اسلام نہیں چاہتا کہ عورت اپنی مرضی سے
اور اپنے سرپرست یا ولی سے مشورہ کئے بغیر نکاح کرلے۔ یہ ضروری نہیں
کہ یہ شخص اس کا باپ یا دادا ہی ہو بلکہ اس کے خاندان کا کوئی فرد ہو۔
وہ اس سے مشورہ کرے اور یہ شخص اس عورت کو کسی دوسرے مرد کے
عقدِ نکاح میں دے۔ یہی ولایتِ نکاح ہے۔
عورت کے نکاح میں ولی کی موجودگی لابدی ہے اور ولی کے بغیر اس کا
نکاح درست نہیں۔ حدیث میں اس سے متعلق اتنی تاکید موجود ہے کہ
آپؐ کی نظر میں لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِی (بخاری) یعنی ولی کے بغیر کا نکاح، نکاح
ہی نہیں۔ اس موضوع پر متعدد دوسری حدیثوں سے بھی روشنی پڑتی ہے۔
حضرت عائشہ رضؓ روایت فرماتی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔

ایما امرأۃٍ نکحت نفسھا بغیر اذنِ ولیھا فنکاحھا باطل فنکاحھا باطل فنکاحھا باطل۔

جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرلیا۔ اس کا نکاح باطل ہے، باطل ہے، باطل،

ابو ہریرہ رضؓ سے مروی ہے:-

لا تزوج المرأۃ المرأۃ ولا تزوج المرأۃ نفسھا، فان الزانیۃ ھی التی تزوج نفسھا۔ (مشکوٰۃ)

کوئی عورت کسی دوسری عورت کا نکاح نہ کرائے اور نہ کوئی خود اپنا نکاح کرے۔ جس عورت نے خود اپنا نکاح وہ گویا زانیہ ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ شارع علیہ السلام کے نزدیک عورت کے نکاح میں اس کے
ولی کی اجازت ضروری ہے۔ ان حدیثوں سے مندرجۂ ذیل اصول مستنبط

ہوتے ہیں :-

اول :- ولی کے بغیر کسی عورت کا نکاح جائز نہیں۔

دوم :- اگر ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا جائے گا تو وہ قانوناً باطل ہوگا

سوم :- کوئی عورت ولی نہیں ہو سکتی، ولی بہرحال مرد ہوگا۔

چہارم :- جو عورت ولی کی موجودگی میں خود اپنا نکاح کر لیتی ہے وہ گویا زنا کے جرم کی مرتکب ہوتی ہے۔

پس مغربی رنگ کی سول میرج جس میں عورت اور مرد، اپنے اولیاء سے استصواب کئے بغیر، محض باہمی اتفاق سے، عدالت کے ذریعے، نکاح کر لیتے ہیں، اسلامی شریعت میں ناجائز ہے۔ ہاں اگر عورت اپنے اولیاء کی اجازت سے نکاح کرتی ہے تو یہ درست ہے۔

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ نکاح کے معاملے میں عورت کو ولی کی رضامندی کا پابند بنا کے اسے کسی طرح کم درجہ دیا ہے۔ یہ محض انتظامی بات ہے اور اس کا مدعا طرح طرح کی خاندانی اور معاشرتی بدنظمیوں کا سدِباب ہے۔ عورت چونکہ بیشتر گھر کے اندر رہتی ہے، اس لئے اسے بیرونی دنیا کا تجربہ کم ہوتا ہے اور وہ کسی مرد سے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل نہیں کر سکتی۔ اور تجربہ کم ہونے کے سبب وہ مہر وغیرہ کی تفصیلات کا بھی فیصلہ نہیں کر سکے گی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جس مرد سے وہ شادی کرے گی وہ گویا اس کے خاندان کا فرد بن جائے گا۔ پس عورت کے خاندان کے مردوں کا حق ہے کہ وہ بہمہ وجوہ دیکھ لیں کہ عورت کس مرد کو ان میں شامل کرنے والی ہے۔

دراصل اسلام نے نکاح کو معاہدہ قرار دیا ہے اور اس میں تمام وہ شرائط

داخل ہیں جو دوسرے معاہدوں میں ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ فریقین بالغ ہوں تاکہ وہ معاہدہ کی شقوں کو سمجھ کر اپنی ذمہ داری کا اندازہ لگا سکیں۔ معاہدہ کے وقت گواہ موجود ہوں۔ اگر فریقین میں سے کوئی نابالغ ہو، تو اس کی طرف سے اس کا ولی شرائط طے کرلے جیسا کہ لین دین کے معاملات میں بھی ہے کہ اگر فریقین نادان اور کم عقل ہیں تو ان کے ولی انصاف کے ساتھ شرطیں پیش کریں گے (البقرہ ۲-۲۸۲) اسی طرح نکاح میں بھی ان تمام شرطوں پر عمل ہوگا۔ عورت کی طرف سے اس کا ولی یہ تمام تفصیلات طے کرے گا۔

عورت کے حقوق

ہاں اگر عورت بالغ ہے، تو وہ خود مرد کا انتخاب کر لینے کی مجاز ہے۔ اگر نابالغ ہے تو اس کے ولی کو چاہیئے کہ وہ خود دیکھ بھال کر کے اس کا نکاح کرے اور تمام شرطوں کا عمدگی سے فیصلہ کرلے۔ لیکن بالغ عورت کے لیئے بھی بہتر یہی ہے کہ وہ جملہ امور کا فیصلہ ولی کی وساطت سے کرے۔ کیونکہ اس کے لیئے خود تفصیلات کا طے کرنا مشکل ہوگا۔ لیکن اس امر میں کسی طرح کا شبہ نہیں کہ عورت کا ولی اس کا نکاح، اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر نہیں کر سکتا عورت بیوہ ہو یا باکرہ، ولی کو بہر حال اس کی رضامندی حاصل کرنا ہوگی۔

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیوہ عورت کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے، جب تک اس سے اجازت نہ حاصل کرلی جائے۔ اور اسی طرح دوشیزہ کا نکاح بھی نہ کیا جائے جب تک اس سے اجازت نہ لے لی جائے، لوگوں نے پوچھا۔ یا رسول اللہ دوشیزہ کی اجازت کیسے لی جائے۔ فرمایا، اگر پوچھنے پر وہ خاموش رہے (متفق علیہ)

اگر ولی اس کی رضامندی کے بغیر کسی جگہ اس کا نکاح کر دے، تو وہ نکاح باطل متصوّر ہوگا اور عورت کو حق ہے کہ وہ اُسے فسخ کرا دے یہی صورت نابالغ کے نکاح کی ہے۔ بالغ ہونے پر وہ چاہے تو نکاح کو قائم رکھے، چاہے فسخ کرالے۔ خنسا بنت خزام انصاریہ کہتی ہیں کہ میرے والد نے میرا نکاح ایک شخص سے کر دیا۔ اس سے قبل میری ایک مرتبہ شادی ہو چکی تھی اور میں کنواری نہیں تھی۔ اس نکاح سے میں خوش نہیں تھی۔ پس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی اور سارا قصہ بیان کیا۔ آپؐ نے اس نکاح کو ناجائز قرار دیا اور اُسے فسخ کر دیا (بخاری۔ کتاب النکاح)

اگر لڑکی یتیم ہو تو اس کے نکاح کے بارے میں اس سے دریافت کیا جائے۔ اگر پوچھنے پر خاموش رہے تو یہ اس کی اجازت ہے اور اگر وہ انکار کرے تو اس پر جبر کرنے کی اجازت نہیں (ترمذی، ابوداؤد۔ نسائی)

ایک کنواری لڑکی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے باپ نے میرا نکاح کر دیا ہے اور میں اُس سے خوش نہیں۔ اس پر آپؐ نے اُسے اختیار دیا (کہ چاہے تو نکاح فسخ کر دے) (ابوداؤد) ان ہی معنوں کی ایک حدیث نسائی میں بھی بیان ہوئی ہے اور ممکن ہے کہ اسی واقعے سے متعلق ہو۔ لڑکی حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ان کی وساطت سے معاملہ حضورؐ تک پہونچایا۔ آپؐ نے اُس کے باپ کو بلایا اور لڑکی کو اختیار دیا کہ چاہے تو طلاق لے لے۔ لڑکی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے باپ نے جو کچھ کیا، میں اب اُسے جائز ٹھہراتی ہوں۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ عورتوں کو اپنے حقوق معلوم ہو جائیں۔

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی شخص کے لیئے جائز نہیں کہ وہ کسی عورت یا لڑکی کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کر دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو لڑکی کو حق ہے کہ نکاح کو عدالت یا قاضی کے ذریعے فسخ کرالے۔ یتیم لڑکی کے نکاح سے متعلق ابو حنیفہ کا یہ مذہب ہے کہ اگر لڑکی نابالغ ہو اور اس دوران میں اس کا ولی اس کا نکاح کسی جگہ کر دے اور وہ شرم سے نکاح کے وقت خاموش رہی ہو تو وہ بالغ ہونے پر چاہے تو اُسے قائم رکھے چاہے فسخ کرالے۔

اگر عورت خود اتنی تجربہ کار ہے تو وہ ولی کی مداخلت کے بغیر بھی اپنے نکاح کی گفت و شنید طے کر لے سکتی ہے جیسے حضورؐ نے ام المومنین ام سلمہؓ سے نکاح کے وقت کیا کہ آپؐ نے براہ راست ان کے پاس حاطبؓ بن ابی بلتعہ کو پیغام نکاح دے کر بھیجا تھا۔ اسی طرح جب ام المومنین زینب بنت جحش سے نکاح کیا تو زید بن حارث کو پیغام دے کر ان کے پاس بھیجا۔

لیکن اگر بات چیت ولی کے ذریعے طے ہوئی ہو تو بھی اس کا کوئی حق نہیں کہ نکاح کے معاملے میں کسی طرح عورت کی منشا اور اجازت کے بغیر کوئی قدم اُٹھائے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو عورت اس کی پابندی پر مجبور نہیں۔

جس طرح دوسرے معاہدوں میں گواہوں کی موجودگی ضروری ہے اسی طرح نکاح میں بھی گواہ رکھے جائیں گے۔ فرمایا لا نکاح الا بشھود۔ گواہوں کے بغیر نکاح درست نہیں

مرد اور عورت، دونوں میں سے کسی کے لیئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی

دوسرے کے پیغام پر پیغام دیں یعنی اگر کسی اور نے اس جگہ نکاح کا پیغام دے رکھا ہے تو جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو جائے دوسرا آدمی اپنا پیغام نہ بھیجے یا اگر نسبت قرار پا چکی ہے، تو جب تک وہ آدمی خود یہ نسبت توڑ نہ دے یا اجازت نہ دے دے، کسی دوسرے کو یہ نسبت تڑوانے کے ارادے سے اپنا پیغام نہیں بھیجنا چاہیئے (بخاری۔ کتاب النکاح)

(۸)

اعلان نکاح نکاح کے موقع پر خوشی کے اظہار کے لیئے گانا اور دُف یا باجا بجانا جائز ہے۔ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ میں نے ایک انصار کی عورت کی رخصتی سادہ طور پر کر دی۔ آپ نے فرمایا۔ عائشہ رض! یہ کیا! کیا تمہارے پاس کوئی بات کھیل کود کی نہیں تھی، حالانکہ انصار کو یہ پسند ہے (بخاری۔ کتاب النکاح) دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔ عائشہ! گیت اور راگ تو ہے ہی نہیں" (مسند احمد حنبل) عموماً گانے بجانے کو کراہت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، حالانکہ اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ خوشی کے موقعوں پر اس کا اظہار ممنوع نہیں۔ حضور علیہ السلام کی زندگی کا واقعہ ہے کہ ایک موقع پر بعض حبشی لونڈیاں حضرت عائشہ کے پاس بیٹھی جنگ بعاث کے گانے گا رہی تھیں کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے اور خاموشی سے لیٹ رہے۔ اتنے میں حضرت ابوبکر رض بھی تشریف لائے اور انھوں نے لونڈیوں کو گانے پر ڈانٹا تو آپ نے فرمایا۔ ابوبکر، ان کو چھوڑ دو، ہر ایک قوم کا ایک عید کا دن ہوتا ہے (بخاری) اس سے معلوم ہوا کہ خاص خاص خوشی کے موقعوں پر گانا اور ڈھول، تاشہ یا دف بجانا اور اس ذریعہ سے

خوشی کا اظہار کرنا جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ " لہو الحدیث" کا مصداق نہ بن جائے اور " لغو" کی حد تک نہ پہنچ جائے۔

ولیمہ خوشی اور رونق کے علاوہ باجے اور گانے سے ایک اور فائدہ بھی مقصود ہے کہ اس سے نکاح کا اعلان اچھی طرح ہو جائے گا۔ یہی مقصود ولیمہ کی دعوت سے ہے، جو خاوند کی طرف سے زفاف کے بعد دی جاتی ہے ولیمہ سنت ہے اور آپؐ نے فرمایا کہ ولیمہ ضرور کرنا چاہیئے خواہ وہ معمولی درجہ کا اور چھوٹے پیمانے ہی کا کیوں نہ ہو (متفق علیہ) نیز فرمایا کہ ولیمہ میں امیر غریب سب طبقوں کے لوگوں کو بلانا چاہیئے اور جسے ولیمہ کی دعوت ملے، اُسے ضرور جانا چاہیئے۔ (مسلم۔ کتاب النکاح)

(۹)

مہر نکاح کے ساتھ سب سے پہلی جو چیز وابستہ ہے، وہ مہر ہے۔ مہر وہ رقم یا چیز ہے جو مرد اپنی منکوحہ کو بلا کسی معاوضہ کے بطور ہدیہ دیتا ہے۔ فرمایا:-

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء ۴-۴) — اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے بلا کسی معاوضے کے اُنھیں دے دو۔

قرآن نے مہر کے لیئے لفظ "نحلہ" استعمال کر کے اس کی حقیقت واضح کر دی کہ یہ خاوند کی طرف سے بیوی کو تحفۂ بے بدل ہے۔ یہ عورت کی قیمت نہیں کہ اس کا باپ وصول کر لے جیسا کہ جاہلیت میں رواج تھا۔ ولی اس رقم کو بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی شکل میں بھی اپنے لیئے وصول نہیں کر سکتا۔ مثلاً اسلامی شریعت میں نکاحِ شغار —— کی اجازت نہیں۔ حضرت رسول کریم صلعم نے اس سے منع فرمایا ہے (متفق علیہ) اور

شغار یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی کا نکاح دوسرے شخص کے ساتھ اس شرط پر کردے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کردے گا اور ان دونوں نکاحوں میں مہر کچھ نہیں ہوگا۔ یا دو شخصوں کے درمیان یہ معاملہ طے ہوجائے کہ تو اپنی بہن کا میرے ساتھ نکاح کردے اور میں اپنی بہن کا نکاح تیرے ساتھ کردیتا ہوں اور دونوں میں مہر نہ ہو صحیح مسلم میں ایک دوسری روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اسلام میں شغار کوئی چیز نہیں۔ شغار سے منع کرنے کا سبب یہی ہے کہ دونوں عورتوں میں سے کسی کو بھی کچھ نہیں ملتا اور مرد آپس میں معاملہ کرکے مہر کی ادائی سے بچ جاتے ہیں

لیکن یہ ضروری نہیں کہ مہر نقد روپیہ ہی کی صورت میں ہو۔ شارع علیہ السلام نے اس پر اصرار فرمایا ہے کہ مہر ضرور ہونا چاہیئے تاکہ عورت کو اپنی اہمیت اور برتری کا احساس ہو اور مرد کو بھی بیوی کی قدر وقیمت کا اندازہ ہو لیکن اگر مرد کے پاس مال نہیں تو وہ کسی اور صورت میں عورت کو فائدہ پہنچا کر اس کمی کو پورا کردے سکتا ہے۔ مثلاً لونڈی کو آزاد کرکے اس سے نکاح کیا جائے تو اس کی آزادی ہی گویا اس کا مہر ہے۔ آپؐ نے ایک صحابی کا نکاح ایک عورت سے اس شرط پر کردیا کہ وہ شخص اپنی بیوی کو قرآن کی چند سورتیں یاد کرائے جو خود اسے حفظ تھیں (متفق علیہ) اور یہ تعلیم اس کا مہر تصور کی گئی۔

مہر ایسی رقم نہیں کہ خاوند چاہے تو ادا کرے چاہے تو نہ کرے جیسے بعض طبقوں میں بڑی بڑی رقمیں مہر میں مقرر کی جاتی ہیں حالانکہ خاوند اور بیوی دونوں کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ یہ رقم کبھی ادا نہیں کی جائے گی یہ سراسر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے حضرت رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص

کسی عورت سے نکاح کرے اور اس نے نیت یہ رکھی ہو کہ وہ مقررہ مہر ادا نہیں کرے گا تو وہ گویا زانی ہے، اسی طرح جس نے قرض لیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اسے ادا نہیں کرے گا وہ چور ہے (مسند احمد بن حنبل) عدم ادائی کے گناہ سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مہر کی رقم اتنی ہی مقرر ہو، جسے خاوند آسانی سے ادا کر سکے۔ اسی لیئے آپؐ نے حکم دیا کہ "لا تغالوا فی المھور النساءً" (مسند احمد حنبل) کہ تم اپنی بیویوں کے مہر زیادہ نہ مقرر کرو۔

حضرت رسول کریم صلعم کا طریقہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپؐ نے حضرت عائشہ سے ہجرت سے قبل مکہ میں نکاح کیا تھا۔ لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ہجرت ہو گئی۔ مدینہ میں پہنچنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے درخواست کی کہ حضورؐ اپنے اہل کو اپنے گھر لے آئیں (یعنی عائشہؓ کی رخصتی کرالیں) تو آپؐ نے جواب دیا کہ اس وقت میرے پاس مہر ادا کرنے کو ضروری رقم نہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میرا مال خدمت میں حاضر ہے۔ اس پر آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے قرض لیا اور مہر ادا کر کے حضرت عائشہؓ صدیقہ کو رخصت کرا کے اپنے گھر لے آئے۔ لیکن اس سے یہ نہ خیال کیا جائے کہ جب تک مہر کی رقم ادا نہ کی جائے رخصتی نہیں ہو سکتی یا خلوت صحیحہ کی اجازت نہیں۔ بلکہ شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر خاوند کے لیئے یک مشت یا عین نکاح کے وقت مہر کی ادائی ممکن نہ ہو تو وہ اس رقم کو بعد میں، بالاقساط اپنی زندگی میں ادا کر دے سکتا ہے۔ یہ ایک قرض ہے، جو بہر حال مرد کو ادا کرنا پڑے گا اور اگر وہ اسے ادا کرنے سے پہلے وفات پا جائے تو تقسیم جائداد سے پہلے دوسرے قرضوں کی طرح یہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔

مہر، عورت کی ملکیت ہے اور اس پر کسی دوسرے کا حق نہیں۔ وہ اسے

اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکتی ہے اور اس سے متعلق وہ جس طرح چاہے وصیت کر دے۔

قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ مہر مقرر کیئے بغیر نکاح ہو سکتا ہے اور اس کا عدم تقرر، نکاح کو باطل نہیں کر دیتا ہے البتہ خلوت صحیحہ سے پہلے اس کی ادائی یا کم از کم تقرر لازمی ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً (البقرۃ ۲ : ۲۳۶)

اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو بحالیکہ نہ تم نے انھیں ہاتھ لگایا ہو نہ ان کے لیے جو کچھ مہر مقرر کرنا تھا، مقرر کیا ہو۔

پس معلوم ہوا کہ نکاح، مہر مقرر کرنے کے بغیر بھی ہو سکتا ہے، ورنہ طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طلاق تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب شرعی طور پر مرد اور عورت رشتۂ نکاح میں منسلک ہو چکے ہوں۔ لیکن اس سے اگلی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خلوت سے پہلے کم از کم مہر مقرر ہو جانا چاہیئے۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً (البقرۃ ۲ : ۲۳۷)

اور اگر ایسی صورت پیش آئے کہ تم انہیں چھونے سے پہلے طلاق دے دو اور جو کچھ مہر مقرر کرنا تھا، وہ کر چکے ہو۔

پہلے یہ کہہ کر نہ تم نے انھیں ہاتھ لگایا ہو اور نہ ان کا مہر ہی مقرر کیا ہو بتا دیا کہ جب تک تم نے انھیں چھوا نہیں طلاق میں کوئی حرج نہیں اگر مہر بھی مقرر نہیں کیا گیا لیکن مابعد یہ کہہ کر اگر چھونے سے قبل مہر مقرر ہو چکا ہو" ظاہر کیا کہ مباشرت سے پہلے تو مہر ضرور مقرر ہو گا۔ البتہ مہر کے بعد کوئی ایسی بات ہو جائے کہ تم اسے طلاق دینا چاہو تو ایسا کر سکتے ہو۔

مہر کی مقدار خاوند کی حیثیت کے مطابق ہوگی یہ قنطار یعنی سونے کا ڈھیر بھی ہو سکتا ہے (النساء ۴-۲۰) لیکن یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ محض دکھاوے کے لیئے ایک بڑی رقم مقرر کر دی جائے، جو خاوند کی طاقت سے زیادہ ہو اور جس کی ادائی سے وہ قاصر ہو۔ ہاں اسے اتنا کم بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کی کوئی وقعت بھی نہ رہے اور خاوند جب چاہے بتیس ۳۲ یا اکیاون ۵۱ روپے بیوی کے ہاتھ پر رکھ کر اُسے نکال باہر کرے۔ یہ بہر حال خاوند کی دینوی اور مالی حالت کے مطابق مقرر کیا جائے گا اور اس پر کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں فرمایا۔" اے لوگو! حضرت رسول کریم صلعم اور آپؐ کے اصحاب نے اپنے نکاحوں میں کبھی چالیس اوقیہ یا چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہیں کیا بلکہ یہ اس سے کم ہی ہوتا تھا۔ اس لیئے اگر تم میں سے کوئی شخص اس سے زیادہ مہر مقرر کرے گا، تو میں اسے تسلیم نہیں کروں گا اور زائد رقم بیت المال میں داخل کر دوں گا۔" اس پر حاضرین میں سے ایک عورت نے آپ کو ٹوکا اور کہا۔" اے امیر المومنین! آپ ہمیں وہ چیز دینے سے انکار کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ ہمیں دیتا ہے" اور یہ یہ آیت پڑھی۔ وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا (النساء ۴-۲۰) اور اگر تم ان میں سے کسی کو سونے کا ڈھیر مہر میں دے چکے ہو۔ اُس پر حضرت عمرؓ نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ مدینہ کی عورتیں بھی عمر سے زیادہ فقیہ ہیں۔

مہر کی جو رقم نکاح کے وقت مقرر کی جائے، اس میں باہمی رضامندی سے بعد میں کمی جا سکتی ہے

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ	اور مہر مقرر کرنے کے بعد اگر آپس کی رضامندی
فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ	سے کوئی بات ٹھہر جائے تو ایسا کیا جا سکتا ہے

مِنۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ (النساء ۴ = ۲۴) اس میں تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

اس آیت کے مطابق بیوی چاہے تو خاوند کو مہر کا کچھ حصہ یا سارے کا سارا معاف کر دے سکتی ہے۔ مہر کی اداشدہ رقم صرف دو صورتوں میں واپس لی جا سکتی ہے۔

اول۔ جب عورت اپنی رضامندی سے اُسے واپس دے دے۔

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓــًٔا مَّرِيْٓــًٔا (النساء ۴ = ۴) اگر عورتیں اپنی خوشی سے مہر کا کچھ حصہ تمھیں دے دیں تو تم اسے بے فکر ہو کر مزے سے کھاؤ

چونکہ مہر کی رقم عورت کی خود اس کی ذاتی ملکیت ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں، اس لیے اُسے پورا پورا اختیار حاصل ہے کہ اسے جس طرح چاہے خرچ کرے۔ چاہے تو وہ یہ پورے کا پورا یا اس کا کچھ حصہ خاوند کو واپس دے دے اور اس امر سے کوئی اُسے منع نہیں کر سکتا۔

دوم جب وہ خلع یعنی مرد سے علیحدگی کی خواہش مند ہو۔ طلاق کا بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْــًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ تمھارے لیے جائز نہیں کہ جو کچھ اپنی بیویوں کو دے چکے ہو (طلاق دیتے وقت) اس میں سے کچھ واپس لو۔ ہاں، اگر شوہر اور بیوی کو اندیشہ ہو کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے ٹھہرائے ہوئے حقوق ادا نہیں ہو سکیں گے تو اگر تم دیکھو کہ واقعی ایسی صورت ہے کہ اندیشہ ہے کہ خدا کے ٹھہرائے ہوئے واجبات

عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ۔ (حقوق ادا نہ ہوسکیں گے تو پھر دونوں پر کوئی گناہ نہیں اگر بیوی (آزادی حاصل کرنے کے لیے) بطور معاوضہ (اپنے مہر میں سے) کچھ دے دے)

(البقرہ ۲ = ۲۲۹)

ان دو صورتوں کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں، کہ اسلام اداشدہ مہر کو واپس لینے یا ناادا شدہ میں کمی کرنے کی اجازت دیتا ہو۔ اسلام کے سوا کسی اور شریعت میں مہر کا حکم نہیں اور اس میں شک نہیں کہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوتی تھیں اور اب بھی ہوتی ہیں، ان کی روک تھام کرنے میں یہ بہت کارآمد ہتھیار ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ خاوند جب چاہے عورت کا "طلاق نامہ" لکھ کر اس کے ہاتھ پر رکھ دے اور گھر سے باہر نکال دے۔" لیکن اگر اُسے یہ معلوم ہو کہ مجھے علیحدگی کے ساتھ ہی مہر کی رقم ادا کرنا ہوگی۔ تو ایسا کرنے سے پہلے خوب غور و خوض کرے گا۔ اس کے علاوہ اگر عورت کے پاس اپنی ملکیت ہو تو ازدواجی زندگی کے دوران میں بھی مرد اس کی زیادہ عزت کرے گا اور اگر اسے طلاق مل جائے گی، تو بھی اسے بسر اوقات کے لیے نہ کسی کا محتاج ہونا پڑے گا اور نہ وہ بے حیائی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوگی۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ یہی مال اس کے لیئے کسی اور بہتر جگہ نکاح کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔

(۱۰)

اہلی زندگی خانگی زندگی میں، اسلام نے مرد اور عورت کے حقوق یکساں قرار دیئے ہیں:-

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ ۲ = ۲۲۸)	اور عورتوں کے لیئے بھی اسی طرح کے حقوق مردوں پر ہیں، جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ عــہ

لیکن اس اصول مساوات کے باوجود، مرد کو بعض امور میں عورت پر فضیلت دی ہے۔

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ ۲ = ۲۲۸)	البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ دیا گیا ہے۔

اور دوسری جگہ اس فضیلت کے اسباب کا ان الفاظ میں کیا۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (النساء ۴ = ۳۴)	مرد، عورتوں کے کارفرما اور متکفل ہیں۔ اس لیئے اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر (خاص خاص باتوں میں) فضیلت دی ہے اور اس لیئے بھی کہ مرد اپنی کمائی (عورتوں پر) خرچ کرتے ہیں۔

گویا اصولاً بلحاظ حقوق دونوں میں کوئی فرق نہیں لیکن بعض عملی حالتوں

حاشیہ عــہ نہ صرف یہ بلکہ عورت اور مرد کے اعمال کا بدلہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک سا ہے۔ وہاں بھی ایک کو دوسرے پر کسی طرح کی ترجیح نہیں دی فرمایا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (النحل ۱۶ = ۹۷)	اچھے عمل کوئی کرے، مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، ہم اسے یقیناً پاک زندگی عطا کریں گے اور اُنھوں نے جو اچھے عمل کیئے ہیں ان کا بدلہ دیں گے۔

اسی طرح سورۂ احزاب ۳۳ (۳۵) میں بھی عورتوں اور مردوں کو یکساں طور پر روحانی مدارج عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

کے باعث ایک کو دوسرے پر ترجیح حاصل ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے اگرچہ بالعموم بنی نوع انسان کی مساوات کا اصول قائم کیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے برابر ہے، لیکن اس کے باوجود فرمایا کہ جہاں بھی دو شخص مل کر سفر کریں یا ایک ساتھ کوئی کام کریں تو وہ اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کرلیں۔ اور دوسرا اس کے احکام کی پابندی کرے۔ پھر امیر کی صفات بیان کردیں کہ وہ روحانی اور جسمانی اور عقلی لحاظ سے بہتر ہو۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک، دوسرے سے کمتر ہے یا اس کے ماتحت ہے۔ بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ کاروبار میں انتظام کے ایک ہاتھ میں رہنے سے نظام قائم ہے۔ کیونکہ جہاں بھی کسی گروہ میں ہر ایک فرد اپنی رائے میں مختار اور اُس پر عمل کرنے میں آزاد ہوگا، لازم ہے کہ کام خراب ہو جائے بلکہ بہت ممکن ہے کہ ان اشخاص میں بھی آپس میں لڑائی جھگڑا پیدا ہو جائے۔ اسی طرح یہاں بھی یہ اصول قائم کیا، کہ عورت اور مرد برابر ہیں۔ دونوں کے حقوق یکساں ہیں۔ لیکن بعض خصوصیات کے سبب مردوں کو عورتوں پر وجہ ترجیح حاصل ہے۔ مثلاً مرد کے قوار، عورت سے زیادہ مضبوط ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دنیوی معاملات میں مرد زیادہ دوراندیش اور عورت سے زیادہ صائب رائے ہوتا ہے۔ چونکہ اس پر باہر کی دنیا میں آنے جانے کی کسی طرح کی پابندی عائد نہیں ہوتی اس لیئے روزی کمانے کا کام بھی مرد ہی کے ذمے لگا یا۔ آج اگر مغرب اور مغرب کی تقلید میں، مشرق میں بھی کساد بازاری اور معیار زیست کے غیر ضروری طور پر بلند ہو جانے کی وجہ سے، عورتوں کو بھی کسب معیشت کا کام کرنا پڑتا ہے تو مرد خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ مغرب میں عورتوں کی تعداد، مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔ مرد ایک سے زیادہ نکاح نہیں کرسکتا۔ اس لیئے ان عورتوں

کو جن کی شادی نہیں ہو سکتی اور کوئی ان کا نگرانِ حال نہیں ہوتا، مجبوراً اپنے ہاتھ سے اپنی روزی کا سامان پیدا کرنا پڑتا ہے۔

پس مردوں کو، گھر کا مالک اور روزی کمانے والا ہونے کی وجہ سے عورتوں پر ایک فضیلت حاصل ہے۔ اس کے مقابلے میں عورتوں کو بھی مردوں پر ایک فضیلت حاصل ہے کہ انھیں گھر بیٹھے، آرام سے ہر چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ گویا عورتیں مخدوم ہیں اور مرد خادم۔ وہ کماتا ہے اور وہ خرچ کرتی ہے۔ البتہ چونکہ مرد کماتا ہے، اس لیئے وہ عورت سے آمد و خرچ کا حساب طلب کرنے کا بھی حق دار ہے۔ اور یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ جس گھر میں عورت سے خرچ کے معاملے میں باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، وہاں ہمیشہ تنگ دستی کا سامنا رہتا ہے۔ حضرت ابی بکرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ جو قوم اپنے معاملات میں عورت کو حاکم بنالے گی وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو گی (لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ) (بخاری)

بعض لوگوں نے اس بات سے بھی مرد اور عورت میں عدم مساوات کا نتیجہ نکالا ہے کہ جہاں ایک مرد کی گواہی مکمل ہے، وہاں عورتوں کی صورت میں دو کا حکم ہے۔ یہ خاص حالات کی وجہ سے ہے۔ ورنہ جیسا کہ لعان کے احکام میں ذکر ہوا ہے الزام زنا میں مرد اور عورت دونوں پر چار گواہ پیش کرنا لازم ہے اور دونوں کی قسم بھی ایک سی ہے جہاں ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی کا حکم دیا ہے۔ وہ صرف مالی معاملات ہیں۔ عورتیں حساب کتاب کی باتیں جلد بھول جاتی ہیں، کیونکہ انھیں ایسے کاموں سے کم واسطہ پڑتا ہے۔ وہ عموماً خانہ داری کے دھندوں میں مشغول رہتی ہیں۔ اس لیئے بالکل ممکن ہے کہ انھیں یاد نہ رہے کہ قرض اور اس سے متعلق دوسرے امور میں کیا شرائط طے ہوئی تھیں۔ اس لیئے

حکم دیا کہ اگر ایک مرد کی گواہی نہ مل سکے تو دو عورتوں کو گواہ رکھ لو تا کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا سکے۔ خود سورۂ بقرہ کے متعلقہ مقام پر یہی وجہ بیان کر دی گئی ہے (۲-۲۸۲) دیگر تمام امور میں نہ قرآن نے اور نہ بعد کے فقہا ہی نے عورت کی شہادت کو مرد سے کم وقعت دی ہے۔

بیوی کے حقوق

ا۔حسن معاشرت

ازدواجی زندگی میں اگر مرد اور عورت کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں، تو ذمہ داریاں بھی ہیں۔ پہلے مرد کو حکم دیا:۔

عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (النساء ۴-۱۹) — عورتوں کے ساتھ معاشرت میں نیکی اور انصاف ملحوظ رکھو۔

اسلام سے پہلے عرب میں عورت کی اہلی زندگی نہایت قابلِ رحم تھی۔ قدر و منزلت تو درکنار، اسے جانوروں سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی تھی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ "خدا کی قسم، زمانۂ جاہلیت میں ہماری نظر میں عورتوں کی کوئی ہستی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ خدا نے ان سے متعلق جو احکام نازل کرنا چاہے نازل کر دیئے اور جو حقوق ان کے مقرر کرنا تھے، مقرر کر دیئے۔" (مسلم۔ کتاب الطلاق) اور تو اور عورت، ڈھور ڈنگر اور دوسرے مال، سامان کی طرح رہن تک رکھی جا سکتی تھی (بخاری۔ حدیث قتل کعب بن اشرف) اور اگر وہ رہن رکھی جا سکتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ فروخت بھی کی جا سکتی ہے۔ غرضکہ وہ محض مرد کی خواہشاتِ نفسانی کی تسکین کا ذریعہ تھی اور مرد پر اس کی طرف سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔ اسلام نے بتایا کہ عورت کے بھی، مرد پر ایسے ہی حقوق ہیں، جیسے مرد کے عورت پر ہیں اور وہ اہلی زندگی میں ہر طرح انصاف اور نیک سلوک کی حق دار ہے۔

اسلام نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دے کر بھی اسی امر کی طرف اشارہ

کیا ہے۔ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (النساء ۴ : ۲۱) اور تمھاری عورتیں تم سے مضبوط عہد لے چکی ہیں۔ اس مِیثاقِ غلیظ کی تفسیر خود رسول کریمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں یوں فرمائی ہے :-

وَاستَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا	عورتوں سے نیک سلوک کرو۔ کیونکہ تم نے
فَاِنَّكُمْ اَخَذْتُمُوْهُنَّ بِاَمَانَةِ	اُنھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور امانت
اللهِ (مسلم۔ کتاب الحج)	لیا ہے۔

گویا نکاح کو ایک امانت قرار دیا اور جیسے ہر ایک معاہدے میں دونوں فریقوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں اور ان پر کچھ ذمہ داریاں بھی عاید ہوتی ہیں، ایسے ہی امانت کا حال ہے۔ چونکہ نکاح ایک معاہدہ اور ایک امانت ہے، اس لئے جیسے مرد کے عورت پر بعض حقوق ہیں، ویسے ہی عورت کی طرف سے اس کے ذمے بھی بعض فرائض ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے فرمایا۔ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ عورتوں سے اہلی زندگی میں نیکی اور انصاف کا سلوک کرو۔ خود حضرت رسول کریم صلعم نے فرمایا۔ خیرکم خیرکم لاهله۔ تم میں سے اچھا وہی ہے جو اپنے اہل یعنی بیوی بچوں کے لئے اچھا ہے۔

۲۔ نان نفقہ مرد کی عورت پر فضیلت کی دوسری وجہ یہ بیان کی کہ وہ عورت پر اپنی کمائی میں سے مال خرچ کرتا ہے۔ یعنی اس کی جملہ ضروریات کا کفیل ہے۔ اور یہ کیا ہیں؟ اس کی خوراک، سکونت لباس، زیورات، وغیرہ۔ مرد کا فرض ہے کہ وہ اپنی حیثیت اور آمدنی کے مطابق عورت کی ان ضروریات کا خیال رکھے۔ یہ مہر کے علاوہ مالی ذمہ داری ہے۔ مہر ایک تحفہ ہے جو نکاح کے ساتھ ہی بیوی کو ادا کیا جاتا ہے۔ اب اس

خروج کا ذکر ہو رہا ہے جو عرفاً نان نفقہ کے نام سے مشہور ہے اور جب تک عورت، اس کے عقد نکاح میں ہے یہ مرد پر فرض ہے۔

۳-اعتماد اس کے علاوہ مرد کا فرض ہے کہ وہ عورت پر اعتبار کرے۔ گھر کے معاملات میں اس سے مشورہ کرتا رہے خود شارع علیہ السلام کا عمل اس معاملے میں یہی تھا۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَ اَظْھَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ۔

(التحریم ۶۶ - ۳)

اور جب نبی نے اپنی ایک بیوی سے راز کی بات کہی اور اس بیوی نے یہ راز فاش کر دیا اور اللہ نے نبی کو اس معاملہ سے آگاہ کر دیا۔ تو نبی نے (اس بیوی کو سارا حال نہ بتایا بلکہ) اس کا کچھ حصہ بتایا اور باقی میں چشم پوشی سے کام لیا۔

یہ ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔ خانگی معاملات میں عورت، مرد کی ہمراز داں ہے۔ لیکن اگر عورت غلطی یا نادانی سے کوئی خلافِ مصلحت کام کر بیٹھے تو مرد کو چاہیئے کہ اس کی تشہیر نہ کرے اور نہ اُسے علانیہ ملامت کرنا شروع کر دے جس سے ہم چشموں میں اس کی سُبکی ہو۔ عورت کی عزت و وقار کی حفاظت مرد کا فرض اولین ہے، کیونکہ یہ خود اس کی عزت اور وقار ہے۔ عورت کی سُبکی سے مرد کی سُبکی لازم آتی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مرد اسے اس کی غلطی سے آگاہ کر دے اور آئندہ کے لیئے اسے محتاط رہنے کا مشورہ دے۔ خود مرد سے بھی بارہا غلطی ہو جاتی ہے جہاں عورت کو درگذر کرنا پڑتی ہے۔ قرآن نے عورت اور مرد کے تعلقات کو ایک نہایت لطیف مثال کے ذریعے بیان کیا ہے۔

ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ عورتیں تمہارے لیئے لباس (کا درجہ رکھتی)

اٰھُنَّ ۔	ہیں اور تم ان کے لیئے لباس (کا درجہ رکھتے) ہو
(البقرہ ۲ - ۱۸۷)	

اور لباس سے متعلّق ایک دوسری جگہ کہا :۔

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا	اے لوگو! ہم نے تمھیں لباس دیا ہے جو تمھارے عیب ڈھانکتا ہے اور (تمھاری) زینت (اور آرائش کا ذریعہ) ہے۔
(الاعراف ۷ - ۲۶)	

پس معلوم ہوا کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کی کمیوں کو پورا کرنے والے ہیں۔ مرد کا فرض ہے کہ وہ عورت کی غلطیوں پر پردہ ڈالے اور عورت کو چاہیئے کہ وہ مرد کے نقائص کو ظاہر نہ ہونے دے۔

۴۔ حقوق زوجیّت (ایلاء)

مرد پر ایک اور ذمّہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ حتی الوسع حقوق زوجیّت ادا کرنے سے دریغ نہ کرے۔ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ اگر خاوند بیوی کو دق کرنا چاہتا، تو قسم کھا لیتا کہ میں بیوی سے مقاربت نہیں کروں گا۔ اِسے اصطلاح میں ایلاء کہتے ہیں۔ عورت غریب مُعلّقہ ہو کر رہ جاتی ۔ نہ مُطلّقہ نہ بیوہ (کہ اور شادی ہی کر سکے) نہ شوہر والی (کیونکہ شوہر نے اس سے قطع تعلّق کر لیا ہے)۔ ایلاء کی قسم ایک محدود مُدّت کے لیئے بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ حضرت رسول کریم صلعم نے ایک ماہ کے لیئے قسم کھائی تھی یہ بھی درست نہیں کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیئے حلال ٹھہرائی ہے، انسان کا کوئی حق نہیں کہ اُسے اپنے اوپر حرام قرار دے لے۔

قرآن کہتا ہے :۔

لِلَّذِیۡنَ یُؤۡلُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِہِمۡ	جو لوگ اپنی بیویوں کے قریب جانے کی

تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

قسم کھالیں تو ان کے لئے چار ماہ کی مہلت ہے۔ پھر اگر اس مدت کے اندر وہ رجوع کرلیں (اور بیوی سے ملاپ کریں) تو اللہ رحمت سے بخشنے والا ہے۔

(البقرۃ ۲ = ۲۲۶)

یعنی اگر بیوی کی کسی غلطی کی وجہ سے تم نے یہ قسم کھائی ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رحمت و غفر کا اتباع کرتے ہوئے اسے معاف کردو۔ اور اگر کسی معقول سبب کے بغیر تم نے یوں ہی قسم کھالی تھی تو قسم کا کفارہ دے کر رجوع کرلو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری غلطیوں کو بخش دے گا۔ اس جگہ فاء کا لفظ استعمال کرکے یہ بتادیا کہ تمھارا رجوع کرلینا اچھا فعل ہے کیونکہ فاء کے معنی ہی "اچھی حالت کی طرف رجوع کرنا" ہیں۔ ہاں اگر خاوند چار ماہ تک رجوع نہ کرے تو پھر بعض فقہا کے نزدیک خود طلاق واقع ہوجائے گی اور وہ عورت مطلقہ کی مدت ختم کرکے دوسرا نکاح کرسکتی ہے اور بعض کے نزدیک اسے قاضی یا عدالت کے ذریعے خاوند کو طلاق دینے کے لئے مجبور کرنے کا حق ہوجاتا ہے، خود بخود طلاق واقع نہیں ہوتی۔

عبادت میں زیادہ شغف بھی بیوی سے بے توجہی کا باعث ہوسکتا ہے۔ اگر خاوند دن بھر روزہ رکھے اور رات کو نمازیں پڑھتا رہے تو ظاہر ہے کہ وہ بیوی کے حقوق ادا کرنے سے قاصر رہے گا۔ حضرت رسول کریمؐ نے اسی لئے اتصالِ صیام یعنی روزے پر روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے اور زیادہ سے زیادہ داودی روزوں کی اجازت دی ہے، کہ ایک دن روزہ رکھو ایک دن نہ رکھو (بخاری کتاب الصوم) اسی طرح عبادت میں بھی اعتدال کرنے کو ارشاد فرمایا۔ حضرت ابوجحیفہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت سلمانؓ فارسی اور حضرت ابودرداؓ

کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا تھا، حضرت سلمانؓ ایک دن حضرت ابودرداءؓ کے مکان پر گئے۔ اُمّ درداء پھٹے پرانے کپڑے پہنے سامنے آئیں تو حضرت سلمان نے ان سے پوچھا "کہو یہ کیا حال کر رکھا ہے"۔ ام درداء کہنے لگیں "تمہارے بھائی ابودرداء کو دنیا کی ضرورت نہیں ہے"۔ اتنے میں ابودرداء آ گئے اور سلمان کے لیئے کھانا تیار کر کے کہا، کھاؤ۔ سلمان بولے میرا روزہ ہے۔ ابودرداءؓ نے کہا۔ جب تک تم نہ کھاؤ گے میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ جب رات ہوئی (اور دونوں نے کھانا کھا لیا) تو ابودرداء (نماز کیلئے) اُٹھنے لگے۔ سلمان بولے، سو جاؤ۔ اس پر ابودرداء سو گئے۔ (رات گئے پھر کسی وقت) اُٹھے اور (نماز کے لیئے) جانے لگے تو سلمان نے پھر کہا۔ سو جاؤ۔ ابودرداء پھر سو گئے۔ اخیر رات میں سلمان نے کہا۔ اب اُٹھو۔ چنانچہ دونوں نے اُٹھ کر نماز ادا کی۔ پھر سلمان کہنے لگے۔ تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور نفس کا بھی اور گھر والوں کا بھی۔ لہٰذا ہر ایک حق دار کا حق ادا کرو۔ دن میں جب ابودرداء حضرت رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ سلمانؓ نے سچ کہا (بخاری۔ کتاب الصوم)

مسند احمد میں اسی طرح کا واقعہ حضرت عثمان بن مظعون سے متعلق بیان ہوا ہے۔ حضرت عثمان بہت عبادت گزار اور راہبانہ زندگی بسر کرنے والے تھے۔ ایک دن ان کی بیوی، حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں تو انھوں نے دیکھا کہ وہ ہر طرح کے زنانہ سنگار وغیرہ سے عاری ہیں۔ پوچھا کہ کیا سبب ہے تو بولیں کہ میرے میاں دن بھر روزہ رکھتے ہیں، رات بھر نمازیں پڑھتے ہیں، میں سنگار کس کے لیئے کروں۔ جب آپؐ تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے قصہ بیان کیا۔ اس پر حضور علیہ السلام، عثمان کے پاس گئے اور ان سے فرمایا کہ عثمان! ہمیں رہبانیت

کا حکم نہیں ہوا ہے۔ کیا میرا طرزِ زندگی پیروی کے لائق نہیں۔ آپ نے اس بارے میں صحابہ سے خاص طور پر فرمایا کہ خدا کی قسم! میں تمھاری بہ نسبت خدا سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں اور بہت متقی ہوں۔ اس کے باوجود روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ نماز بھی پڑھتا ہوں۔ سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اب جو میری سنت سے روگردانی کرے گا وہ میرے طریقے پر نہیں۔ (بخاری۔ کتاب النکاح)

اس کے مقابلے پر عورت کو بھی یہ حکم دیا کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ نہ رکھے۔ (متفق علیہ)

بعض اوقات خاوند کسی دوسرے ملک میں چلا جاتا ہے اور ایک لمبی مدت کے لیئے بیوی سے جدا رہتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ اگر غیر حاضری کی مدت طویل ہو تو چاہیئے کہ وہ بیوی بچّوں کو ساتھ لے جائے۔ کیونکہ لمبی غیر حاضری سے طرح طرح کی جسمانی اور روحانی خرابیوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے خود حضرت رسول کریم صلعم کا یہی طریقہ تھا کہ کسی سفر یا غزوہ پر تشریف لے جاتے تو بیویوں میں قرعہ ڈالتے اور جس کے نام کا قرعہ نکل آتا اُسے ساتھ لے جاتے۔

مجالد رضؓ سے روایت ہے کہ ایک رات حضرت عمر رضؓ حسب معمول گشت لگا رہے تھے کہ اُنھوں نے ایک عورت کی زبان سے چند شعر سُنے، جن کا مطلب یہ تھا کہ "یہ رات کس قدر لمبی ہو گئی ہے اور اس کے کنارے کس قدر چھوٹے ہو گئے ہیں اور میں رو رہی ہوں کہ میرا شوہر میرے پاس نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کھیل کے اس رات کو گذاروں۔ خدا کی قسم، خدا کا ڈر نہ ہوتا، تو اس تخت کے پائے ہلا دیئے جاتے۔" حضرت عمر رضؓ نے یہ سُن کر سخت افسوس کیا اور فوراً اپنی صاحبزادی اُمّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ، کے پاس گئے اور پوچھا بیٹی!

ایک عورت، شوہر کے بغیر کتنے دن گزار سکتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ "چھ ماہ" اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہ حکم جاری کر دیا کہ کوئی شخص چھ ماہ سے زیادہ فوج کے ساتھ باہر نہ رہے۔

۵۔ عدمِ تشدد خاوند کا ایک اور فرض یہ ہے کہ وہ بیوی پر ظلم اور زیادتی نہ کرے۔

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (البقرۃ ۲ - ۲۳۱)

اور ان کو ضرر پہنچانے اور زیادتی کرنے کے لیئے نہ روک رکھو جو ایسا کرے گا اس نے گویا اپنے آپ پر ظلم کیا اور خداوند تعالیٰ کی آیات سے مذاق نہ کرو۔

یہ آیت اس موقع کی ہے، جہاں خاوند کو بیوی کو بار بار طلاق دینے اور رجوع کرنے سے منع کیا ہے۔ بعض خاوند بیوی کو دق کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیئے اسے ایک ہی بار طلاق دے کر آزاد نہیں کر دیتے بلکہ طلاق دیتے ہیں اور اس کے مکمل ہونے سے پہلے ہی رجوع کر لیتے ہیں۔ پھر طلاق دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت، غریب ایک دائمی ذہنی تکلیف میں مبتلا رہتی ہے۔ یہ گویا خدائی احکام سے تمسخر ہے۔ اسی سے منع فرمایا ہے کہ ان پر ظلم اور زیادتی کرنے کے لیئے نہ روک رکھو لیکن یہاں ایک عام اصول بیان کر دیا ہے کہ عورت پر ظلم اور تعدی نہ کرو۔ ظلم اور تعدی کی تعیین نہیں کی، کیونکہ یہ جسمانی بھی ہو سکتی ہے اور ذہنی اور روحانی بھی۔

(۱۱)

بیوی کے فرائض جہاں بیوی کے خاوند پر حقوق، وہیں خاوند کی طرف سے بیوی پر بھی بعض ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

فالصالحات قانتات حافظات للغیب بما حفظ اللہ (النساء ۴ = ۳۴)	جو نیک بیویاں ہیں وہ (خاوند کی) اطاعت شعار ہوتی ہیں (اور شوہر کی غیر حاضری میں بھی (اس کے حقوق اور مفاد کی) حفاظت کرتی ہیں، جیسے اللہ نے (ان کے حقوق کی) حفاظت کی

اِن ہی معنوں میں حضرت رسول کریم صلعم بھی فرماتے ہیں کہ بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تو اُسے دیکھے تو تیرا دل خوش ہو جائے۔ جب تو اُسے کچھ کرنے کو کہے تو وہ تیری اطاعت کرے اور اگر تو اُس کے پاس موجود نہ ہو تو وہ تیرے مال میں اور اپنے نفس میں تیرے حقوق کی حفاظت کرے۔

۱۔ اطاعت شعاری

بیوی پر سب سے پہلا فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ قانتہ یعنی شوہر کی اطاعت شعار ہو۔ اطاعت کے کتنے مدارج ہیں۔ گھرستی بھی چھوٹے پیمانہ پر ایک سلطنت کا حکم رکھتی ہے جس کا حاکم اعلیٰ شوہر ہے اور اس کی نائب بیوی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حاکم اعلیٰ کی اطاعت نہیں ہوگی تو سلطنت کا کاروبار درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لئے بیوی کا یہ فرض ہے کہ جن معاملات پر خاندان کے اتحاد اور ترقی کا دارومدار ہے یا جن پر اس کی اہلی زندگی کی خوشی اور مسرت منحصر ہے یا ان کے بچوں کے مستقبل اور اخلاق پر اثر پڑنے کا امکان ہے، ان میں وہ خاوند کے احکام پر عمل کرے اور اُسے شکایت کا موقع نہ دے۔

البتہ ایک بات ایسی ہے، جس میں بیوی کا حق ہے کہ وہ شوہر کا حکم ماننے سے انکار کر دے یعنی جب شوہر اسے کوئی ایسا کام کرنے کو کہے جس سے شریعت کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ کیونکہ خدا کا حکم بہر حال مقدم ہے اور

خالق کے حکم کے مقابلہ میں مخلوق کا حکم کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لَا طاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق۔

۲۔ حقوق کی حفاظت

عورت کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ خاوند کی موجودگی ہی میں اس کے حقوق اور مفاد کی حفاظت نہ کرے بلکہ اس کی غیر حاضری میں بھی اس کا خیال رکھے۔

حدیث میں ہے کہ نیک بیوی وہ ہے کہ جب تم اس کے پاس نہ ہو تو وہ تمھارے مال اور اپنے نفس میں تمھارے حقوق کی حفاظت کرے (بیہقی) مندرجہ صدر آیت میں صرف حافظات کہہ کر نہایت بلیغ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے مثلاً بیوی کا فرض ہے کہ نہ فضول خرچی اور اسراف سے خود خاوند کے مال کو نقصان پہونچائے اور نہ تغلب اور خیانت کا موقع دے۔ خاوند کے رازوں کو فاش نہ کرے اور اس کے کاروبار یا پیشے کی باتوں کی حفاظت کرے تاکہ ان کے عام ہو جانے سے اُسے تجارت میں نقصان نہ پہنچے۔ اپنی عصمت اور عفت کی حفاظت کرے جو اس کا اپنا سب سے بڑا جوہر اور خاوند کی اس کے پاس سب سے بڑی امانت ہے۔ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر توجہ کرے اور ان کے اخلاق کی حفاظت کرے وغیرہ

لیکن ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یہی سوال امیر معاویہؓ کی والدہ ہندہ نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا۔ کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہے اور مجھے خرچ سے تنگ رکھتا ہے۔ کیا اگر میں خفیہ طور پر کچھ لے لیا کروں تو اس میں کچھ حرج ہے؟ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تو اور تیرے بچے اتنا لے سکتے ہیں جو نیک چلنی اور دیانت داری سے خرچ کرنے کے لئے تمھارے لئے کافی ہو (متفق علیہ) بلکہ ایک دوسرے موقع پر فرمایا

کہ جب عورت اعتدال کے ساتھ اپنے گھر کا خرچ کرتی ہے اور اس میں سے
صدقہ دیتی ہے بشرطیکہ اس کی نیت گھر بگاڑنے کی نہ ہو تو خرچ کرنے کا ثواب
عورت کو ملتا ہے اور کمانے کا مرد کو (متفق علیہ)۔

بِمَا حَفِظَ اللہ کہہ کر یہ ظاہر کیا کہ تمھارے جو حقوق شوہر کے ذمہ تھے
اللہ تعالیٰ نے اُن کی حفاظت کر دی ہے۔ اس لیئے تمھیں چاہیئے کہ جب خاوند
تمھارے حقوق کی نگہداشت میں دریغ نہیں کرتے تو تم بھی ان کے حقوق کا خیال
رکھو اور ان کی اطاعت شعاری کو اپنا شیوہ بنالو۔

۳۔ نیکی میں تعاون

عورت کا ایک اور فرض یہ ہے، کہ وہ خاوند کو نیکی
اور خیر سے نہ روکے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ
عورت اپنی زینت و آرائش، ضروریات و زیورات وغیرہ پر خرچ کرنے
میں دریغ نہیں کرتی۔ لیکن اگر کہیں مرد نے کسی نیکی کے کام میں حصّہ لینے یا خدا
کی راہ میں کچھ خرچ کرنے کا ارادہ کیا، تو وہ جھٹ سے اس پر اعتراض کر دیتی
ہے اور طرح طرح کے عذر پیش کرنے لگتی ہے۔ مستقبل کی ضروریات، مالی تنگی،
روزگار کا غیر یقینی ہونا، غرض مختلف عذر کیئے جاتے ہیں۔ یہ خاوند کی خیر خواہی
اور اس سے دوستی نہیں بلکہ اس سے دشمنی ہے۔ نیک بیویاں اگر خاوند کے
دنیوی مفاد کی پوری پوری حفاظت کرتی ہیں تو وہ اس کے دینی مفاد اور روحانی
ترقی میں بھی ممد اور معاون ثابت ہوتی ہیں۔ فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، یاد رکھو کہ
إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ	بعض معاملات دینیہ میں حایل ہونے کی
وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا	وجہ سے) تمھاری بیویاں اور تمھاری
لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ	اولاد میں سے بھی بعض تمھارے دشمن

وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(التغابن ۶۴ - ۱۴)

بن جاتے ہیں۔ پس ان سے بچتے رہو (اور دین کو دنیا پر قربان نہ کرو) ہاں اگر تم (اپنی بیویوں اور اولاد کو ان کی غلطیوں پر) معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جہاں حضرت رسول کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ میں نے مردوں کے لئے عورتوں سے زیادہ نقصان پہنچانے والی اور کوئی چیز اپنے پیچھے نہیں چھوڑی (بخاری۔ کتاب النکاح) تو وہاں بھی یہی روحانی اور اخلاقی نقصان مراد ہے۔ کیونکہ وہ خاندان کے ساتھ تعاون علی الخیر نہ کرکے اس کے نیک ارادوں میں روک بن کر، یا اسے بُرا مشورہ دے کر اس کی روحانی ترقی میں حائل ہو سکتی ہے، جو یقیناً بہت بڑا نقصان ہے۔

پس اس بارے میں عورت پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ مرد کی دینی اور روحانی ترقی کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرے اور جہاں تک ہو سکے، نیکی کے کاموں میں اس کی مدد کرے۔

۴۔ تربیت اولاد

بیوی پر تربیت اولاد کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ مرد اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے اولاد کی دیکھ بھال میں اتنا وقت صرف نہیں کر سکتا، جتنا عورت کر سکتی ہے اولاد کا دن رات ماں کے ساتھ رہنا، پہلے دن سے اس سے زیادہ مانوس ہونا اور خود عورت کے دل میں بھی مرد سے زیادہ محبت اور ممتا کی موجودگی اس بات کے ثبوت ہیں کہ اگر عورت چاہے تو اس سلسلے میں مرد سے بہت زیادہ خدمت کر سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اولاد کو بے علم رکھنا، اُسے

قتل کر دینے کے مترادف ہے۔ جیسے فرمایا:۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام ۶ - ۱۴۰)	یقیناً وہ لوگ سخت نقصان اٹھاتے ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو اپنی بیوقوفی سے بے علم رکھ کر قتل کر دیا۔

اولاد کی تربیت کے وہی اصول ہیں جو یتامیٰ سے متعلق سورۂ نسار میں بیان ہوئے ہیں کہ ان کی جسمانی ضروریات مہیا کرو اور انھیں اچھی تعلیم اور آداب سکھاؤ (۴ - ۴)

(۱۲)

اختلاف کا علاج

خانگی زندگی کے نشیب و فراز مشہور ہیں۔ گاڑی آہستہ آہستہ ایک سیدھی ہموار سڑک پر جا رہی ہے، کہ راستہ خراب آ گیا۔ جھٹ سے ایک پہیہ کسی گڑھے میں گر جاتا ہے یا کسی پتھر سے ٹکرا جاتا ہے اور گاڑی آگے چلنے سے انکار کر دیتی ہے۔ یہی حال میاں بیوی کا ہے۔ یہ آئے دن کا تجربہ ہے کہ ایک جوڑے کی اہلی زندگی نہایت سکون اور اطمینان سے بسر ہو رہی ہے۔ اچانک گھر میں کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے کہ ایک، دوسرے سے اتفاق کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ بار ہا یہ اختلاف ابتدا ہی میں رفع ہو جاتا ہے اور از سرِ نو گھر کی فضا میں پہلا سا سکون اور مسرت پیدا ہو جاتی ہے لیکن بعض اوقات یہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ پھر یہ خلیج کسی طرح پٹنے ہی میں نہیں آتی قرآن نے چونکہ مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے۔ اس لیئے لازماً اس پہلو سے اس کی ذمہ داری بھی عورت کی نسبت بڑھ گئی ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں طاقت ہو، اسے اس کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط برتنا چاہیئے۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس طاقت کے نشے میں کوئی ناانصافی کر بیٹھے اور دین اور دنیا دونوں جگہ نقصان اُٹھائے۔ دین میں اس لیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقتوں کا ناجائز استعمال کرکے اپنی بیوی پر ظلم کیا۔ اور دنیا میں اس لیے کہ ایک تو گھر کی راحت و آسائش کھوئی اور دوسرے ہم سایوں اور ہم چشموں میں خفت ہوئی۔ یکے نقصانِ مایہ و دیگر شماتت ہم سایہ۔ اسی لیے حضرت رسول کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل کے ساتھ بہترین سلوک کرتا ہے (متفق علیہ) اس باب میں ان کی اہلی زندگی سب کے لیے اسوۂ حسنہ ہے آپ کی اتنی بیویاں تھیں مگر اس کے باوجود اُنھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہونے دی جس پر انھیں سختی کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

اختلاف کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:-

اوّل قصور بیوی کا ہو۔

دوم قصور خاوند کا ہو۔

سوم قصور دونوں کا ہو۔

قرآن میں ان تینوں صورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ احکام ہیں۔

بیوی کا قصور

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا

اور جن بیویوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، انھیں نصیحت کرو اور سمجھاؤ پھر خواب گاہوں میں ان سے علیحدگی اختیار کر لو اور اُنھیں جسمانی سزا دو۔ پھر اگر وہ تمھارا کہنا مان جائیں تو اُنھیں الزام دینے

عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا (النساء ۴ = ۳۴) کے لیئے راہیں نہ ڈھونڈو۔

یہاں تین مرحلے بتائے ہیں۔ پہلے مرحلے پر بیوی کو نرمی اور محبت سے سمجھانے کی ہدایت کی۔ کیونکہ اختلاف آرار کوئی انوکھی بات نہیں۔ یہ ازل سے موجود رہا ہے اور ابد تک رہے گا۔ اگر بیوی، خاوند کی رائے سے متفق نہیں تو خاوند فوراً دل برداشتہ ہو کر قطع تعلق نہ کرلے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ بیوی پر اپنا زاویۂ نگاہ واضح کرے۔ خود بھی بیوی کے دلائل پر غور کرے۔ اگر وہ صحیح ہوں، تو بیوی سے اتفاق کرلے۔ ورنہ خود اُسے قایل کرنے کی کوشش کرے۔ اگر مرد کی بات معقول ہے تو یقینیاً ایک "اطاعت شعار" بیوی اپنی غلطی کا اعتراف کرکے اس کی بات مان لے گی۔

اگر عورت، اس تمام کوشش کے باوجود، نافرمانی سے باز نہ آئے اور معاملہ اہم ہو، جس میں اختلاف روا نہیں رکھا جاسکتا، تو پھر اجازت دی ہے کہ اس سے قطع کرلو۔ اس سے بات چیت کرنا بند کردو۔ محبت والفت کا اظہار نہ کرو اور ایک خواب گاہ میں استراحت کرنے سے اجتناب کرو۔ مدعا یہ ہے کہ عورت، خاوند کے عمل سے محسوس کرے کہ یہ مجھ سے ناراض ہے اور جب تک میں اپنی اصلاح نہیں کروں گی وہ مجھ سے کسی قسم کا تعلق رکھنے پر آمادہ نہیں۔ ایک باغیرت اور شریف بیوی کے لیئے اتنی سزا ہی کافی ہو گی اور بہت حد تک یہی اس کے رویّے میں تبدیلی پیدا کردے گی۔ حضرت رسول کریمؐ فرماتے ہیں کہ اس عورت پر فرشتے لعنت کرتے ہیں جس سے رات بھر اس کا شوہر ناراض رہا۔ (بخاری)۔

اگر ان تمام کوششوں کے باوجود بیوی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، تو سب سے آخر میں اُسے جسمانی سزا دینے کی اجازت دی۔ ظاہر ہے کہ کوئی شوہر،

معمولی حالات میں اس حد تک نہیں جا سکتا کہ نوبت زد و کوب تک پہنچ جائے۔ اگر کوئی ایسی ہی اہم بات ہو تو اسے جسمانی سزا کا خیال کرنا چاہیئے، یعنی جب معاملہ حد سے گذر رہا ہو اور اس کی اصلاح کسی اور طرح ممکن نہ ہو۔ چنانچہ اس کی ایک مثال حضرت رسول کریم صلعم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں دی ہے۔ فرمایا:۔

واتقوا اللہ فی النساء فانھن عندکم عوان ولکم علیھن لا یوطئن فرشکم احداً تکرھونہ فان فعلن ضربوھن ضرباً غیر مبرح

(اے لوگو!) عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ وہ تمھارے پاس اسیروں کے مانند ہیں۔ اور تمھارا اُن پر حق ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو تمھارے گھر میں قدم نہ رکھنے دیں جسے تم پسند نہیں کرتے۔ پس اگر وہ ایسا کریں تو اُنھیں سزا دو مگر ایسی سزا جس سے ان کے اعضا میں کسی طرح کا نقص نہ واقع نہ ہو جائے۔

لیکن اگر عورت سزا دینے سے بھی نہ سدھرے تو بجائے اس کے کہ انسان آئے دن کی دانتا کلکل سے گھر کو جہنم کا نمونہ بنائے، یہی بہتر ہے کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں دنیا کی عورتوں کو تین طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک وہ ہیں جنھیں لطف و ملائمت سے سمجھا دینا ہی کافی ہے۔ وہ اسی سے اپنی اصلاح کریں گی اور آئندہ خاوند کو کسی طرح کی شکایت کا موقع نہ دیں گی۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جن پر زبانی پند و نصیحت کا چنداں اثر نہیں ہوتا اور ان سے زیادہ سختی کا سلوک کرنے کی

ضرورت ہے۔ ان کے لئے قطع تعلق کا حربہ تجویز کیا۔ تیسری جماعت ان جہلا کی ہے جن پر جسمانی سزا کے سوا اور کوئی بات اثر ہی نہیں کرتی۔ یہاں اجازت دی کہ بے شک انھیں مارو، لیکن ایسی سزا کی اجازت نہیں جس سے جسم کا کوئی عضو ناقص ہو جائے یا جس کا نشان جسم پہ رہ جائے (مسلم) حضورؐ نے منہ پر مارنے سے منع فرمایا ہے (متفق علیہ)

آیت کے آخری ٹکڑے میں ایک اور نصیحت کی کہ جس مرحلے پر بھی بیوی بات مان جائے، وہیں بس کردو۔ اور مزید سختی نہ کرو اور اس سے اس معاملے کی طرف اشارہ بھی نہ کرو۔ نہ یہ کوشش کرو کہ اسے قصوروار ثابت کرنے کے لئے بہانے تلاش کرو۔ یا اگر اس کا نقطۂ نگاہ صحیح ہو تو تم اسے غلط ثابت کرنے کے لئے حیلہ سازی سے کام لو۔ ممکن ہے کہ تم اس میں کامیاب ہو جاؤ۔ لیکن یاد رکھو اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے، اس کے غضب سے ڈرو۔

شوہر کا قصور دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کو مرد کی طرف سے کسی قسم کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو۔ صرف ایک بیوی ہونے کی صورت میں اس کا امکان کم ہے۔ لیکن چونکہ اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت ہے اس لئے جب ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو زیادتی اور بے رغبتی کا زیادہ اندیشہ ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ خاوند تمام بیویوں کے درمیاں عدل نہ کر سکے اور یوں جن سے وہ بے توجہی کا برتاؤ کر رہا ہے وہ ادھر میں لٹکتی رہ جائیں۔ ایسے حالات کے لئے ارشاد فرمایا:۔

وَاِنِ امْرَاَۃٌ خَافَتْ مِنْ م بَعْلِھَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَآ اَنْ یُّصْلِحَا	اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے سرکشی یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ باہم مصالحت کرلیں

بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ	کیونکہ (لڑائی جھگڑے سے) صلح بہتر ہے۔
خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ	انسانی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق
الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَ	ادا نہیں کرنا چاہتا مگر اپنے لیئے اور مانگتا
تَتَّقُوا فَإِنَّ اللّٰهَ بِمَا	ہے۔ اگر تم باہم اچھا سلوک کرو اور (ظلم
بِمَا تَعْمَلُوْنَ	کرنے سے) ڈرو تو اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال
خَبِيْرًا ۔ ۝	سے واقف ہے (وہ تمھیں اس کا اجر
(النساء ۴ : ۱۲۸)	دے گا)۔

اگر بیوی کو اندیشہ ہے کہ خاوند دوسری شادی کرنے والا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ حتی الامکان ان شکایات کا ازالہ کرے جن کی وجہ سے وہ اس سے بے توجہی برت رہا ہے۔ یا پھر خاوند ہی اور شادی کرنے کا ارادہ ترک کر دے۔ اگر وہ متفق نہ ہو سکیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا، کہ گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہے گا جس سے خود ان دونوں کو بھی تکلیف ہو گی اور اولاد کے اخلاق پر بھی بُرا اثر پڑے گا۔ یہاں انسانی فطرت کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ شُحّ اس بخل کو کہتے ہیں جس میں حرص اور طمع بھی شامل ہو۔ یعنی انسان دوسروں کے حقوق کی ادائی میں تو بخل کرتا ہے لیکن اپنے لیئے اور زیادہ طاقت اور حقوق طلب کرتا ہے۔ خاوند چاہتا ہے کہ میں بیوی کی ضروریات پر کم از کم خرچ کروں لیکن وہ میری آزادی پر کسی طرح معترض نہ ہو۔ نہ صرف یہ کہ بیوی کو کم خرچ دوں بلکہ جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ بھی اس سے ہتیا لوں۔ ایسا ہی بیوی کی خواہش ہوتی ہے کہ خاوند میری معمولی سی معمولی فرمائش کی تکمیل میں دریغ نہ کرے اور خرچ کرنے میں مجھے نہ ٹوکے۔ لیکن اگر کہیں خاوند نے کچھ خرچ کرنا چاہا تو اس میں نئو سئو طرح بیں میکھ نکالنے لگے گی۔ اس لیئے فرمایا کہ ایک دوسرے سے

مصالحت کر لو۔ بیوی کا فرض ہے کہ وہ خاوند کو کوئی موقع نہ دے کہ وہ اس سے اعراض کر سکے۔ اور خاوند کو ہدایت کی کہ بیوی سے حسن و احسان سے پیش آؤ۔ اور خدا سے ڈرتے رہو اور ناانصافی اور سخت گیری سے بچتے رہو۔

لیکن اگر بیوی کا یہی خیال ہے کہ وہ خاوند سے کسی طرح نباہ نہیں کر سکتی اور اس بارے میں اس کی تمام کوشش رائیگاں جائے گی تو پھر اس کے لیے راستہ کھلا ہے وہ قاضی یا عدالت کے ذریعے خلع کرا لے سکتی ہے۔

دونوں کا قصور تیسری صورت یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں قصوروار ہوں۔ اس سے متعلق فرمایا۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ○ (النساء ۴ - ۳۵)

اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ میاں بیوی میں تفرقہ پڑ جائے گا تو ایک پنچ شوہر کے خاندان سے مقرر کرو اور ایک پنچ بیوی کے خاندان سے اگر وہ دونوں (پنچ) ان میں صلح کرانے کی کوشش کریں تو اللہ ضرور ان دونوں میں موافقت کرا دے گا۔ بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

یہاں مخاطب ساری جماعت ہے یا ان کی نمائندہ حکومت۔ انھیں حکم دیا کہ اگر کسی گھر میں میاں بیوی کے نفاق کے باعث، حالات کے زیادہ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو تو پھر تمھارا فرض ہے کہ تم مداخلت کر کے صلح کرا دو۔ اور ایک خاندان کو تباہ ہونے سے بچا لو، کیونکہ اس کا اثر سارے سماج پر پڑے گا۔ اس کا طریقہ یہ بتایا کہ ایک پنچائت مقرر کی جائے یعنی چونکہ ان دونوں میاں بیوی کی باہمی کوشش صلح کرنے میں ناکام رہی ہے اور ان دونوں

کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں رہا اس لیئے اب علاج یہ ہے کہ دو ایسے آدمی لیئے جائیں جن پر اُنھیں اعتبار ہو اور جو اُن پر اثر بھی ڈال سکیں۔ ایک آدمی مرد کے خاندان سے لیا جائے اور ایک عورت کے خاندان سے۔ تاکہ عورت اس کے ذریعے اپنی شکایات سنا سکے۔ کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ وہ شرم وحیا یا اور کسی وجہ سے خاوند کے سامنے آنے سے ڈرے۔ چونکہ یہ دونوں پنچ فریقین کے خاندانوں میں سے ہوں گے، اس لیئے قدرتاً ان کے خیر خواہ ہوں گے اور دیانت داری سے کوشش کریں گے کہ ان میں مصالحت ہو جائے۔ نیز انھیں دونوں کی طبائع کا بھی علم ہو گا، اس لئے کسی عدالت یا بیرونی پنچ کی بہ نسبت اُن کے لیئے کسی نتیجے پر پہنچ جانے کا زیادہ امکان ہے۔ اور عدالت میں جانے سے سارے خاندان کی جو تشہیر ہوتی، اس سے بھی دونوں بچ جائیں گے اور معاملہ گھر ہی میں نپٹ جائے گا۔

پنچوں کو بھی ہدایت کی کہ نااتفاقی سے صلح بہتر ہے۔ اگر تم نے صدقِ دل سے صلح کرانے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ بھی تمھاری کوششوں میں برکت دے گا اور دو پھٹے ہوئے دل پھر آپس میں مل جائیں گے۔ لیکن اگر تم نے اپنا فرض نہ پہچانا اور ریشہ دوانیاں کرکے جھگڑے کی خلیج کو اور وسیع کرنا چاہا تو ممکن ہے کہ تم اپنی ناپسندیدہ حرکات میں کامیاب ہو جاؤ اور ان میاں بیوی میں اتحاد نہ ہو سکے، لیکن یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھاری خفیہ سازشیں اور کارروائیاں دیکھ رہا ہے اور اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔

اگرچہ لغت میں حَکَم کے معنی ہی ایسے شخص کے ہیں کہ وہ جو فیصلہ بھی کرے اُسے بے چون وچرا قبول کر لیا جائے خواہ وہ کسی کے منشار اور فہم کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود حضرت علی رضہ نے فرمایا ہے کہ یہ دونوں جو فیصلہ کر دیں گے

وہ ناطق ہو گا اور میاں بیوی کا فرض ہو گا کہ وہ اس پر عمل کریں۔ اس سے بھی پنچوں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اُنھیں چاہیئے کہ تقویٰ اختیار کرتے ہوئے، دیانت داری سے، دونوں طرف کی شکایات سُن کر، اُن کے ازالے کی صورت پیدا کریں اور انھیں آپس میں ملا دیں۔ لیکن اگر وہ دیکھیں کہ یہ بیل کسی طرح منڈھے نہیں چڑھ سکتی اور اختلاف نہیں مِٹ سکتا، تو پھر طلاق کرا دیں تاکہ وہ دونوں آزاد ہو جائیں اور آئے دن کا جھگڑا ختم ہو۔

تیسرا باب

ماں

اسلامی تعلیم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کسی شخص کو کوئی حق نہیں دیتی جس کے ساتھ ہی وہ ایک ذمہ داری بھی اس پر عاید نہ کر دیتی ہو۔ اسی طرح وہ کوئی ذمہ داری بھی عائد نہیں کرتی، جس کے ساتھ کوئی حق عطا نہ کرتی ہو مثلاً اس نے والدین پر اولاد کی تربیت، پرورش اور تعلیم کا بار ڈالا، تو اس کے ساتھ اولاد کو تلقین کی کہ والدین کی خدمت کرو، اور اس طرح والدین کو ایک حق دے دیا۔

والدین کی خدمت کا حکم اور نصیحت تمام مذہبوں میں ہے لیکن قرآن نے حسب معمول اس مسئلے پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ حکم دیا کہ والدین سے نیکی اور احسان سے پیش آؤ اور اُن پر اپنے اموال خرچ کرو۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ	(اور اے نبیؐ) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ
قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ	وہ کیسے خرچ کریں۔ (ان سے) کہو کہ تم
فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ	اپنی اچھی کمائی میں سے اپنے ماں باپ

وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ ۲- ۲۱۵)

اور قریبی عزیزوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور تم جو بھی نیکی کا کام کرو گے، اللہ اسے جانتا ہے۔

گویا صرف ماں باپ کی ضروریات کی کفالت ہی کا نہیں بلکہ ہر حال میں ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک ان کی اپنی جسمانی حالت درست ہے اور وہ خود کام کاج کر سکتے ہیں، اس وقت تک انھیں کسی دوسرے کی مدد کی کچھ ایسی ضرورت نہیں خدمت کی خاص ضرورت اُسی وقت محسوس ہوتی ہے، جب انسان کے لیے تو اکمزور ہو جائیں اور وہ خود محنت کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس حالت سے متعلق ارشاد فرمایا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا

اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کر اور والدین سے حسن و احسان سے پیش آؤ۔ اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تمھارے سامنے کبر سنی کو پہنچیں تو ان سے کبھی اُف تک نہ کہہ اور نہ ہی اُن سے کبھی سختی سے پیش آ بلکہ دونوں سے نرمی اور ادب سے گفتگو کر اور ان کے لیے دل میں جذبات رحم لیے ہوئے عاجزی اور فرمانبرداری سے جھک جا اور دعا کر کہ اے میرے رب جیسے تو نے میرے بچپن میں میری پرورش کی تھی،

فِیْ نُفُوْسِکُمْ اِنْ تَکُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ۝

(بنی اسرائیل ۱۷ - ۲۳ - ۲۵)

اسی طرح اب ان دونوں پر رحم فرما۔ تمھارا رب خوب جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیک عمل کرنے والے ہو، تو وہ بھی رجوع کرنے والوں کو بخشنے والا ہے۔

یہاں بیان کا آغاز خدائے واحد کی عبادت سے کیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمانیت لاثانی ہے اس لیئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا لیکن ظلّی طور پر یہ دونوں صفات ماں باپ میں بھی، بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ بچپن میں بچے کی جو حالت ہوتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن یہ ماں باپ اور ان میں سے بھی خاص طور پر ماں ہی ہوتی ہے، جو کسی خدمت یا معاوضے کا خیال کیئے بغیر بچّے کی غور و پرداخت اور آرام و آسائش کا سارا بوجھ خوشی سے اٹھاتی ہے۔ خداوند تعالیٰ کی صفات ربوبیت و رحمانیت کی مظہر بڑی حد تک وہی ہوتی ہے۔ اس لیئے ربِ حقیقی سے ربِ مجازی کی طرف گریز کیا۔ پھر اس میں بھی ان کی کبرسنی کا خاص ذکر فرمایا۔ بوڑھے آدمی کی حالت بڑی حد تک بچّے سے ملتی جلتی ہے۔ اس لیئے حکم دیا کہ اگر تمھارے والدین میں سے ایک یا دونوں ہی اس سن تک پہنچیں تو تمھارا فرض ہے کہ تم ان کی خدمت بجا لاؤ۔ یہاں دعا بھی وہی سکھائی جس میں اُسے اپنا وہ زمانہ یاد دلایا، جب وہ کمزور اور ناتواں تھا اور اُس کے والدین نے طرح طرح کی مصیبت اور تکلیف اُٹھا کر اُسے پالا پوسا تھا، تاکہ خدمت کرتے وقت اس کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ میں والدین کے لیئے جو کچھ کر رہا ہوں یہ ان پر احسان ہے۔ بلکہ اُسے معلوم ہو کہ میں جو کچھ خدمت کر رہا ہوں، یہ میرا فرض ہے اور ان والدین نے میرے لیئے اس سے

بہت زیادہ کیا تھا۔

والدین سے برتاؤ کے بعض اصول بیان کیے۔ سب سے پہلے حسن و احسان کی تلقین کی۔ چونکہ بڑھاپے میں انسان کے قوا کمزور ہو جاتے ہیں، اس لیئے وہ مخالفت پر جلد مشتعل ہو جاتا ہے۔ مزاج میں خود رائی پیدا ہو جاتی ہے، اس لیئے وہ سختی سے اور بھڑکتا ہے۔ فطرتِ انسانی کی تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہدایت کی کہ والدین سے سختی سے پیش نہ آؤ۔ ان کی خواہشات کا احترام کرو اور ان کے کاموں کی مخالفت نہ کرو۔ ان پر کبھی اعتراض نہ کرو، بلکہ ان سے گفتگو میں بھی نرمی اور ادب پیش نظر رکھو۔

حضرت رسول کریم صلعم فرماتے ہیں وہ شخص بہت ہی ذلیل اور خوار ہے جس نے اپنے ماں باپ میں سے کسی کو یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں اور پھر ان کی خدمت کر کے جنّت میں داخل نہ ہوا (مسلم۔ کتاب البّر والصلۃ والآداب)

نہ صرف یہ کہ انسان خود براہِ راست ان کا ادب کرے، بلکہ کوئی ایسا فعل بھی نہ کرے، جو دوسروں کو ان کی بے ادبی کرنے پر آمادہ کر سکے۔ اسی لیئے آپؐ نے فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے صحابہؓ نے اس ارشاد کو سُن کر عرض کیا۔ "یا رسول اللہ! کیا کوئی ایسا شخص بھی ہے جو اپنے ماں باپ کو گالی دیتا ہے؟" اس پر آپ نے فرمایا، ہاں، ایک آدمی، دوسرے آدمی کے باپ کو گالی دیتا ہے اور وہ اس کے جواب میں اس کے باپ کو گالی دیتا ہے۔ اور وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے اور وہ اس کے جواب میں اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔ (متفق علیہ)

لیکن قرآن نے والدہ کا حقِ خدمت زیادہ بتا دیا ہے کیونکہ بچے کے لیئے باپ کی بہ نسبت وہ زیادہ مصیبت برداشت کرتی ہے اور اس کی

پرورش اور تربیت کا زیادہ بار بھی اس کے کندھوں پر پڑتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ	اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ سے متعلق تاکید کی، (خاص طور پر) ماں (سے متعلق کہ وہ) اس کو جھٹکے پر جھٹکے اٹھا کر لیے لیے پھری اور پھر کہیں دو برس میں جا کر اس کا دودھ چھوٹتا ہے۔ (اسی لیے ہم نے کہا کہ) میرا بھی شکر کرو اور اپنے والدین کا بھی۔ آخر تم سب میرے ہی پاس آنے والے ہو
(لقمان ۳۱ : ۱۴)	

یہاں پہلے ماں باپ دونوں کے حقوق کی حفاظت کا عام حکم دیا۔ پھر ماں کے حقوق پر خاص توجہ دلائی کہ باپ سے زیادہ اُس نے تمہارے لیے مشقت اُٹھائی تھی۔ اس لیے اس کا حق بھی فائق ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا یا رسول اللہ! مجھے کس کے ساتھ حسنِ معاملہ اور محبت کرنا بہتر ہے۔ آپؐ نے فرمایا ماں کے ساتھ۔ اس نے پھر سوال کیا، پھر کون؟ فرمایا، ماں کے ساتھ۔ پوچھا، پھر کون؟ فرمایا، ماں کے ساتھ اس کے بعد جب اُس نے پوچھا کہ پھر کون؟ تو فرمایا، پھر تیرا باپ، پھر تیرا قربت دار۔ (متفق علیہ) ——— اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن اور "داعیِ اسلام" کے نزدیک ماں کا درجہ کتنا بلند ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر ماں باپ خلاف شرع کام کرنے کو کہیں یا ایسا حکم دیں، جس کی تعمیل میں شرک پایا جاتا ہو تو اس میں بھی ان کی اطاعت کی جائے ہم اگر ماں باپ کی خدمت کرتے ہیں تو اس لئے کہ یہ ہمارا اخلاقی

فرض ہے۔ لیکن اگر وہ شرک کی تعلیم میں دین اور ہمیں خدائے واحد سے دور لے جانے کی کوشش کریں، جو تمام اخلاقِ فاضلہ کا منبع اور بنیاد ہے تو ہم مجبوراً ان کے لیے ایسے احکام کی تعمیل سے انکار کر دیں گے۔ مگر یہ بھی جائز نہیں کہ اس صورت میں اُن سے قطع تعلق ہی کر لیا جائے، بلکہ معاملاتِ دینی کو چھوڑ کر جہاں تک دنیوی امور یا ان کی آسائش اور راحت کا تعلق ہے، ان کی خدمت بہرحال ہمارا فرض ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

وَ اِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا وَّ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (لقمان ۳۱: ۱۵)

اور اگر وہ تمھیں مجبور کریں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک بنا جس سے متعلق تمھیں کچھ علم نہیں، تو ان کے حکم کی تعمیل نہ کر، لیکن دنیا میں ان کی رفاقت کا حق عمدگی سے ادا کر اور ایسے راستہ پر چل جو میری طرف آتا ہے۔ آخر تم کو لوٹ کر میرے پاس آنا ہے۔ میں تمھیں تمھارے اعمال سے خبر دوں گا۔

اس سے معلوم ہوگا کہ والدین کی خدمت پر کس قدر زور دیا ہے۔ باوجودیکہ وہ مشرکانہ عقائد رکھتے ہیں، اُن کی رفاقت کی نہ صرف تاکید کی بلکہ اُسے "سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ" کہہ کر بتایا کہ والدین کی خدمت قربِ الٰہی کے حصول میں معاون ہوتی ہے۔ احادیث میں بھی والدین اور بالخصوص والدہ کی خدمت کی خاص تاکید ملتی ہے۔ بخاری (کتاب الصلوٰۃ) میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے جہاد کا رتبہ، بادقت نماز اور خدمتِ والدین کے بعد بتایا ہے۔ یہی مضمون ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے۔ معاویہ بن

جابرؓ کہتے ہیں کہ میرے والد نے حضرت رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ یارسول اللہ! میں نے جہاد پر جانے کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ لینے آیا ہوں۔" آپ نے دریافت فرمایا۔ کیا تیری ماں زندہ ہے؟" انھوں نے عرض کیا" ہاں"۔ آپ نے فرمایا" ماں کی خدمت کر، اس لیئے کہ جنت ماں کی قدموں میں ہے۔" (نسائی، بیہقی) مراد یہ تھی کہ تو جہاد پر اس لیئے جانا چاہتا ہے کہ رضائے الٰہی حاصل کرے اور تقرب خداوندی پاکر جنت کا حق دار بنے، تو جا، یہ سب چیزیں تمھیں جہاد میں شامل ہوئے بغیر بھی مل سکتی ہیں۔ جنت تیری ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اس کی خدمت میں رہ اور اس کی رضا حاصل کر۔

اور اس میں مومن اور مشرک ہونے کی کوئی قید نہیں۔ والدین اگر مشرک ہیں تو بھی جیسا کہ اوپر بیان ہوا، (۳۱ : ۱۵) ان کی خدمت اتنی ہی فرض ہے، جتنی ان کے مومن ہونے کی حالت میں۔ حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ میری والدہ بحالتِ کفر میرے پاس آئیں تو میں نے حضورؐ سے مسئلہ دریافت کیا کہ میری والدہ آئی ہیں اور مجھ سے میل جول رکھنے کی خواہش مند ہیں۔ کیا میں ان سے تعلقات قائم رکھوں۔ فرمایا۔" ہاں اپنی ماں سے رشتہ قائم رکھو اور سلوک کرو۔" (متفق علیہ)

چوتھا باب

مُطلّقہ، بیوہ

طلاق اسلام میں نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں دونوں فریق بعض حقوق کے حامل ہیں اور ان پر بعض ذمہ داریاں بھی ہیں۔ متاہلانہ زندگی میں آئے دن ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں، جن سے گھر میں لڑائی جھگڑا ہو جاتا ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایسے حالات میں اسلام نے سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ میاں بیوی کو صلح صفائی سے رہنا چاہئیے۔ فریقین میں سے جس کا قصور ہو، وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلے اور دوسرے کا فرض ہے کہ وہ زیادتی نہ کرے۔ قصوروار کے اظہارِ ندامت کے بعد صلح کرنے میں لیت ولعل سے کام نہ لے۔ پھر فرمایا کہ اگر تمام کوششوں کے بعد بھی، وہ مفاہمت نہ کرسکیں تو خاوند چاہے تو بیوی کو آزاد کر دے، جسے شریعت میں طلاق کہتے ہیں۔

طلاق کے اصول کیا ہیں، ان سے متعلق فرمایا:-

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا	اے نبی! (لوگوں کو یہ حکم سنا دو کہ)
طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ	جب تم عورتوں کو طلاق دو، تو انھیں

فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝

ان کی عدت کی میعاد پوری کرنے کے لئے طلاق دو اور میعاد عدت کے اختتام تک ان کی حفاظت کرو اور اپنے رب سے ڈرو انہیں ان کے گھروں سے باہر نہ نکالو اور نہ وہ خود ہی نکلیں سوائے اس کے انہوں نے علانیہ بدچلنی کی ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرتا ہے، وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے اور انہیں گھر سے اس لئے نہ نکالو کہ تم نہیں جانتے کہ شاید اللہ کوئی بات پیدا کر دے۔

(الطلاق ۶۵-۱)

اس سے دو تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ طلاق بے وجہ نہیں دی جا سکتی۔ دوم طلاق میں عدت کا شمار ہوگا۔ سوم طلاق کے بعد عدت کی میعاد کے ختم ہونے تک بیوی خاوند کے گھر ہی میں ٹھہرے گی۔ ہاں اگر طلاق کی وجہ بیوی کا فحش مبیّن ہے تو اس صورت میں مجبوری ہے، اسے بے شک گھر سے نکالا جا سکتا ہے۔ چہارم طلاق دینے سے پہلے خاوند کو خوب سوچ لینا چاہیے کہ میں کہیں حدود اللہ سے تجاوز تو نہیں کر رہا یعنی خداوند تعالیٰ نے جو حقوق مجھے دیئے ہیں اُن کا غلط استعمال کر کے گناہ کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہوں۔

قرآن نے یہ تو کہا ہے کہ طلاق بے وجہ نہ دی جائے، لیکن کسی جگہ

تصریح نہیں کہ یہ کن اسباب کی بنا پر دی جا سکتی ہے۔ دراصل تمام حالات کا احاطہ کرنا ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ یہ ملک اور موقع کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں ایک سبب فحش ٹیتبین کا ذکر ہے۔ حضرت زینب بنت جحش اور حضرت زید بن ثابت کے طلاق کی وجہ، مزاج کا اختلاف تھا۔ ایسے ہی ثابت بن قیس کی بیوی جمیلہ نے جب خلع کی درخواست کی تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے ثابت بن قیس پر عصہ نہیں آتا۔ نہ اس کے اخلاق یا دین میں مجھے کوئی قابل اعتراض بات نظر آتی ہے، لیکن مجھے اس سے محبت نہیں (بخاری۔ کتاب الطلاق) اس پر آپؐ نے اُسے طلاق دلوادی۔ دراصل اور کوئی وجہ بھی نہ ہو، تو میاں بیوی کے مزاج کا اختلاف ہی بجائے خود ایک بہت بڑی معقول وجہ ہے۔ اگر ان دونوں کے نقطۂ نگاہ میں اتنا تفاوت ہو کہ وہ ایک دوسرے سے محبت ہی نہ کر سکیں تو گویا اس سے نکاح کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔ نہ عورت خاوند کے لیے "سکون" کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ نہ وہ ایک دوسرے کا "لباس" بن سکتے ہیں کہ راحت ہو۔ اور جب گھر کا یہ حال ہو تو اولاد کے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑے گا وہ ظاہر ہی ہے۔

اس سے بظاہر یہ خیال پیدا ہو گا کہ اسلام میں طلاق بہت آسان چیز ہے اور شوہر پر کوئی پابندی ہی نہیں۔ وہ جب چاہے بیوی کو طلاق دے دے۔ ایسا خیال کرنا غلطی ہو گی، کیونکہ اسلام طلاق کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک یہ آخری قدم ہے۔ حضرت رسول کریم صلعم فرماتے ہیں کہ خدا نے جتنی چیزیں انسانوں کے لیے حلال کی ہیں، ان میں سے طلاق اسے سب سے زیادہ ناپسند ہے (ابو داؤد) ایک اور جگہ فرمایا کہ خدا نے دنیا میں کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی، جو اس کی نظر میں طلاق سے زیادہ

ناپسند ہو (دارقطنی)۔

قرآن نے طلاق پر کتنی ہی پابندیاں لگائی ہیں اور اس کی یہ کوشش ہے کہ جہاں تک ہو سکے، خاوند اور بیوی میں جدائی نہ ہو اور وہ آپس میں صلح کر لیں۔ ہاں اگر وہ کسی طرح بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو سکیں تو حکم دیا کہ اس صورت میں طلاق دے دی جائے۔

چونکہ اصلی غرض اصلاح تھی اس لئے سب سے پہلی شرط یہ لگائی کہ اگر وجۂ طلاق فحش مبین نہیں تو نہ خاوند، بیوی کو گھر سے نکالے، نہ بیوی ہی خاوند کا گھر چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جائے۔ کیونکہ ممکن ہے عدّت کی میعاد کے ختم ہونے سے پہلے، ایک ہی گھر میں رہنے کے باعث کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے، جس سے وہ رجوع کر لیں اور وہ دوبارہ آپس میں میل ملاپ ہو جائے۔ اگر بیوی گھر سے چلی جائے گی تو اس صورت میں مصالحت کے مواقع کم ہو جائیں گے۔ ان فحش کی حالت میں وہ بے شک چلی جائے۔ کیونکہ جب اس نے زنا کا ارتکاب کیا تو وہ اب کسی مومن کے نکاح میں نہیں رہ سکتی (النور ۲۴ : ۲) اور اس لیے مصالحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عدت طلاق

عدت سے متعلق فرمایا۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ أَرْحَامِهِنَّ (البقرۃ ۲ : ۲۲۸)	اور جن عورتوں کو ان کے شوہروں نے طلاق دے دی ہو، انھیں چاہیے کہ وہ ماہواری ایام کے تین مہینوں تک اپنے آپ کو (نکاح ثانی سے) روکے رکھیں اور ان کے لیے جائز نہیں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے ان کے شکم میں پیدا کی ہے، اسے چھپائیں

یعنی اگر وہ طلاق کے وقت حمل سے ہوں تو اُن کا فرض ہے کہ اُسے ظاہر کردیں اور اُسے پوشیدہ نہ رکھیں۔ "قروء" کے معنی ہیں "حالت طُہر سے حالتِ حیض میں داخل ہونا" اس سے طلاق کے زمانے کی تعیین ہوتی ہے یعنی ماہواری ایام کے دوران میں طلاق نہیں دی جاسکتی[ع۵]، بلکہ صرف ان دنوں میں جب عورت پاک ہو۔ مشہور حدیث ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بیوی کو ایام ماہواری کے دوران میں طلاق دے دی۔ حضرت عمر رضؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلعم سے کیا۔ آپؐ اس امر پر بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ عبداللہ اپنی بیوی کو واپس لے اور اسے چاہیئے کہ وہ اسے اپنے پاس رکھے یہاں تک وہ پاک ہو جائے۔ اس کے بعد طلاق دینا ضروری ہی ہو، تو پاک ہونے کی حالت میں اُسے طلاق دے اور اس عرصے میں اُسے ہاتھ نہ لگائے اور یہی ہے وہ عدّت، جس کا حکم خداوند تعالیٰ نے دیا ہے کہ اس میں اُن کو طلاق دی جائے۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ وہ رجوع کرے اور پھر اس کو طُہر یا حمل کی حالت میں طلاق دے (متفق علیہ)

ع۵ دوسری جگہ حیض کو باعث مضرت قرار دیتے ہوئے حکم دیا:۔

فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی یَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ

(البقرہ ۲ : ۲۲۲)

پس ایام ماہواری میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو لیں ان کے قریب نہ جاؤ۔ جب وہ پاک ہو لیں تو پھر اللہ کے ٹھہرائے ہوئے طریقے پر اُن کے پاس جاؤ۔

ایام ماہواری کے دوران میں صرف خلوتِ صحیحہ ممنوع ہے، کیونکہ اس سے مرد اور عورت دونوں کو کئی طرح کی بیماریاں لاحق ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان ایام میں [illegible] بیوی سے کامل مقاطعہ کرلے، بلکہ اختلاط اور لطف و محبت سے پیش آنے کی ممانعت نہیں۔ خود حضور علیہ السلام اس حالت میں بیویوں سے ہر طرح محبت کا اظہار کرتے تھے۔

(بخاری۔ کتاب الحیض)

اس سے دو باتیں ثابت ہوگئیں۔ اوّل یہ کہ طلاق ایام ماہواری کے دوران میں نہیں دی جاسکتی اور دوسرے یہ کہ جس طہر میں طلاق دی جائے، اس میں خاوند بیوی سے مقاربت نہ کرے اور اسی طرح تین طہر گزر جائیں اور وہ ایک دوسرے کے نزدیک نہ گئے ہوں تو چوتھا طہر شروع ہونے پر عدّت کی میعاد پوری ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ طلاق نافذ ہو جائے گی۔

اگر عورت کو حیض آتا ہو تو اس کی عدت کا شمار آسان ہے۔ لیکن اگر عورت کو حیض آتا ہی نہ ہو تو اس صورت میں شمارِ عدت کا کیا دستور ہوگا؟ اس سے متعلق فرمایا:۔

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ۔ (الطلاق ۶۵ = ۴)	اور وہ عورتیں (جو کبر سنی کی وجہ سے) حیض سے مایوس ہو چکی ہیں (جن کے متعلق تمھیں کوئی شک ہو، ان کے لئے عدت کی میعاد تین مہینے ہے۔ اور جن عورتوں کو ابھی حیض نہیں آیا ان کے لئے بھی تین مہینے کی مدت ہے) اور حاملہ عورتوں کے لئے وضع حمل کی میعاد ہے۔

عورت کو حیض چار وجہ سے نہیں آتا۔ یا تو کبر سنی کی وجہ سے حیض خود بخود بند ہو جائے۔ یا کسی بیماری کی وجہ سے ایسا ہو جائے یا عورت ابھی اس عمر کو پہنچی ہی نہ ہو؛ جب حیض شروع ہوتا ہے۔ ایسی تینوں حالتوں کے لیے

عہ قرآن کے نزدیک، نکاح کی عمر سن بلوغ ہے۔ لیکن یہ حکم نہیں۔ اس سے پہلے بھی شادی ہو سکتی ہے جیسا کہ اسی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی عورت کی بھی شادی ہو سکتی ہے، جسے ابھی ایام ماہواری شروع بھی نہیں ہوئے۔ اگر قرآن کی نظر میں کم سنی کی شادی جائز نہ ہوتی تو نابالغہ کی عدت سے متعلق احکام بتانا ہی بے سود تھا۔ البتہ حالات کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے کہ ایسی شادی مناسب ہے یا نہیں۔

عدت تین ماہ مقرر کی جو تین قروء کی قائم مقام ہے۔ چوتھی جماعت اُن عورتوں کی ہے، جن کے ایام حمل کی وجہ سے رُکے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں عدت، وضع حمل تک ہوگی، خواہ یہ تین ماہ سے پہلے ہی ہو جائے۔ جونہی بچہ پیدا ہو جائے، عورت کی عدت ختم ہو جائے گی۔ اور وہ اس کے بعد دوسری جگہ نکاح کرلے سکتی ہے۔ اسی لئے پہلے حکم دیا تھا کہ اگر عورت طلاق کے وقت حاملہ ہو، تو اُسے اعلان کر دینا چاہیئے تاکہ بعد میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے اور اب یہاں اس کی عدت کا بیان کر دیا۔

عدتِ بیوہ

شادی شدہ عورت، خاوند کے بغیر دو حالتوں میں ہو سکتی ہے۔ پہلے اس صورت میں کہ اس کا خاوند اسے طلاق دے دے اس کے احکام بیان ہو چکے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خاوند فوت ہو جائے اور عورت بیوہ رہ جائے۔ اس صورت میں حکم دیا:-

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ	اور تم میں سے کسی کی وفات ہو جائے
وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ	اور وہ اپنے پیچھے بیوہ چھوڑے، تو
بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا	انھیں چاہیئے کہ چار ماہ دس دن تک
فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ	نکاح ثانی نہ کریں۔ پھر جب یہ میعاد ختم
عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ	ہو جائے تو تم پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ
بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ ۲ : ۲۳۴)	اپنی پسند کے مطابق، اپنے لئے فیصلہ کرلیں

گویا بیوہ کی عدت معمولی حالات میں چار ماہ دس دن ہے۔

اگرچہ کسی عزیز کی موت پر بلے اختیاری طور پر رو دینا اور گریہ ممنوع نہیں کہ یہ فطری چیز ہے اور رونے سے روک نہیں سکتی۔ لیکن شارع علیہ السلام نے میت پر واویلا کرنے، چیخنے، چلانے اور پٹینے، نوحہ اور بین کرنے، کپڑے

پھاڑنے اور سر منڈانے سے سخت بیزاری کا اظہار فرمایا ہے (متفق علیہ) اور تاکید کی ہے کہ جو عورت، خدا اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے، اس کے لیئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے، ہاں شوہر کی موت کا سوگ چار ماہ دس دن تک کیا جا سکتا ہے (متفق علیہ) دراصل چار ماہ دس دن میں بھی سوگ کا زمانہ صرف چالیس دن ہے۔ باقی تین ماہ وہی عدت ہے جس کا حکم طلاق کی حالت میں دیا تھا۔ اور یہ عام حالت سے زیادہ اس لیئے رکھا تاکہ اس سے رشتۂ نکاح کا احترام واضح ہو۔

جاہلیت میں اگر کسی عورت کا خاوند فوت ہو جاتا، تو وہ تنگ و تاریک کوٹھری میں چلی جاتی اور بدترین سڑے بُسے کپڑے پہن لیتی۔ نہ خوشبو استعمال کر سکتی تھی نہ کوئی اور چیز۔ یہاں تک کہ اسی طرح پورا ایک سال گذر جاتا۔ جب سال ختم ہو جاتا، تو اس کے پاس کوئی جانور — بکری، گدھا یا پرندلایا جاتا اور وہ اس جانور سے اپنے جسم یا شرم گاہ کو مَس کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ اس کال کوٹھری سے باہر نکلتی اور اسے ایک مینگنی دی جاتی۔ وہ اس مینگنی کو مکان کے باہر پھینک دیتی۔ اس کے بعد وہ جو کچھ چاہتی، کرتی اور خوشبو وغیرہ لگا سکتی تھی۔ (متفق علیہ)

اسلام نے جاہلیت کی ان تمام لغو رسموں کو ختم کر دیا۔ البتہ یہ ضرور کیا کہ عدت کے ایام میں عورت نہ سرمہ لگائے نہ خوشبو استعمال کرے، نہ کوئی بناؤ سنگار کرے (بخاری۔ کتاب الحیض) کیونکہ عدت کے اختتام تک وہ نکاح ثانی تو کر نہیں سکتی، بلکہ سوگ کے ایام میں یہ نامناسب بھی ہے۔ ہاں اس بات کی ممانعت نہیں کہ وہ عدت کے دنوں میں کسی ضرورت سے گھر سے باہر جائے۔ اگر وہ کسی ضروری کام سے باہر جانا چاہتی ہے تو اُسے روکا نہیں جا سکتا (مسلم۔ کتاب الطلاق)

اگر خاوند کی وفات کے وقت عورت حاملہ ہو، تو اس کی میعاد، مندرجۂ صدر آیت کی رو سے وضع حمل ہے۔ جب تک وضع حمل نہ ہو جائے، نہ مطلقہ کا نکاح ثانی جائز ہے نہ بیوہ کا۔ لیکن اگر مطلقہ کے ہاں تین ماہ کے اندر یا بیوہ کے ہاں چار ماہ دس دن کے اندر، بچہ پیدا ہو جائے تو پھر اسے اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ مزید انتظار کرے اور نکاح ثانی نہ کرے۔ وضع حمل کے بعد وہ جب چاہے، نکاح ثانی کر سکتی ہے اور کسی کو حق نہیں کہ وہ اُسے اس سے روکے۔ بیوہ بھی چار ماہ دس دن کے بعد نکاح ثانی کا حق رکھتی ہے۔ اس کے بعد نہ اس کے رشتہ دار اس کے رستے میں حائل ہو سکتے ہیں، نہ مرحوم خاوند کا سوگ ہی اس کے مانع ہو سکتا ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو اپنے لیے بہتر خیال کرتی ہے اس پر عمل کرے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضؓ سے (متفق علیہ) روایت ہے کہ سبیعہ بنت حارث کا شوہر حجۃ الوداع کے زمانے میں فوت ہو گیا۔ اس وقت وہ حمل سے تھی، لیکن تین دن کے بعد ہی اس کے بچہ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد پیغام آنے پر حضرت رسول کریم صلعم نے اس کا دوسرا نکاح کر دیا۔ (مسلم۔ کتاب الطلاق میں یہ روایت زیادہ تفصیل سے بیان ہوئی ہے)

عدت کے اختتام سے پہلے نکاح منع ہے، لیکن اس دوران میں انھیں بالواسطہ، یا اشارۃً پیغام نکاح دیا جا سکتا ہے:-

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ	(اور جن بیوہ عورتوں سے تم نکاح
فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ	کرنا چاہو) تمھارے لیے کوئی گناہ نہیں
خِطْبَةِ النِّسَاۤءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ	اگر تم (اشارے کنایے سے) ان پر
فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ	اپنا خیال ظاہر کر دو یا اپنے دل میں
اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ	نکاح کا ارادہ پوشیدہ رکھو۔ اللہ جانتا

وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ○	ہے کہ قدرتاً تمھیں ان کا خیال آئے گا، لیکن ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ چوری چھپے (نکاح کا) وعدہ کر لو۔ اس دستور کے مطابق انھیں نکاح کا پیغام دے سکتے ہو، اور جب تک عدت کی میعاد پوری نہ ہو جائے، نکاح کی گرہ نہ باندھو اور یقین کرو کہ جو کچھ اس بارے میں تمھارے دل کے اندر ہے، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ پس اس سے بچے رہو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا
(البقرہ ۲ = ۲۳۵)	اور رحم کرنے والا ہے۔

یہ احکام عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہیں۔ انسان شرعی مجبوریوں کے تحت، زمانہ عدت کے اندر، نکاح کرنے سے تو رک سکتا ہے لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ اپنے دل پر بھی اتنا قابو حاصل کر لے کہ بیوہ عورت سے نکاح کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آئے۔ اس لیے کہہ دیا کہ عدت کے دوران میں تم کوئی ایسی بات کہہ سکتے ہو، جس سے تمھارا عندیہ عورت پر واضح ہو جائے۔ تاکہ عورت اگر چاہے، تو وہ بھی اشارے کنائے سے اپنی رائے کا اظہار کر دے۔ لیکن عدت کے دوران میں نہ نکاح جائز ہے نہ صاف لفظوں میں پیغام نکاح ہی دیا جا سکتا ہے۔

حاملہ مطلقہ اگر طلاق کے وقت بیوی حاملہ ہو، تو شوہر کا فرض ہے کہ اُسے وضعِ حمل تک بدستور اپنے گھر میں رکھے۔

اَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰى ۝	انھیں اپنے مقدور اور حیثیت کے مطابق اپنے مکان میں رکھو اور اُنھیں دق کرنے کے خیال سے تکلیف نہ دو اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کا سارا خرچ برداشت کرو، یہاں تک کہ وضع حمل ہو جائے۔ پھر اگر وہ تمھارے کہنے پر (بچے کو) دودھ پلائیں، تو انھیں (اس رضاعت کی مدت کے لیئے) ان کی اجرت ادا کرو اور یہ باہمی مشورے سے طے کرلو۔ اگر تم ایک دوسرے کو پسند نہ کرو، تو کسی دوسری عورت کو دودھ پلانے کے لیئے رکھو۔

(الطلاق ۶۵ : ۶)

یعنی وضع حمل تک عورت کی سکونت، خوراک، لباس وغیرہ کا تمام خرچ مرد اپنی حیثیت کے مطابق برداشت کرے۔ اس دوران میں وہ عورت کو اس خیال سے تکلیف نہ پہونچائے کہ وہ تنگ آکر کسی اور جگہ چلی جائے۔ رضاعت کی مُدّت دو برس ہے۔ اگر ماں بچے کو دودھ پلائے، تو خاوند مزید دو برس تک اس کے اخراجات کا کفیل ہوگا۔

مرضعہ مُطلّقہ دوسری صورت یہ ہے کہ طلاق کے وقت عورت کی گود میں دودھ پیتا بچّہ ہے۔ اس سے متعلق حکم دیا:-

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ	(اگر خاوند چاہے کہ) بچے کی ماں اُسے

أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ۔

(البقرہ ۲ : ۲۳۳)

دودھ پلائے تو ماں بچے کو پورے دو برس دودھ پلائے اور جس کا بچہ ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اس دوران میں ماں کے کھانے کپڑے کا مناسب انتظام کرے۔ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ تو ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے (اگر باپ مر جائے تو) اس کے وارث بھی (عورت کے کھانے کپڑے کے) ذمہ دار ہیں۔ ہاں اگر ماں باپ باہمی مشورے سے (دو برس سے پہلے) بچے کا دودھ چھڑا لیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں اور اگر تم (ماں کی جگہ کسی دوسری عورت سے) دودھ پلوانا چاہو تو بھی کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ (بچے کی ماں کو) دستور کے مطابق سب کچھ دے دو۔

عدت کے اغراض

(۱) جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، خاوند، بیوی کو صرف حالتِ طہر میں طلاق دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ

اس طہر میں اس نے بیوی سے مقاربت نہ کی ہو۔ عدت کے لئے طلاق کے دن سے تین قرد، کا زمانہ شمار ہوگا۔ لیکن مرد کو اختیار ہے کہ وہ عدت کے اختتام سے پہلے رجوع کرلے۔ اگر عدت کے دوران میں ایک دفعہ بھی تعلقاتِ زناشوئی قائم ہو جائیں تو طلاق کالعدم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد دونوں شریعت کی نظر میں حسبِ سابق میاں بیوی ہیں اور قدرتاً پھر عدت کے شمار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ دراصل تین ماہ کی عدت کا اوّلین مقصد ہی یہ ہے کہ میاں بیوی میں صلح ہو جائے۔ چونکہ عورت، مرد کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتی ہے، اس لئے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس کے دل میں خیال نہ آئے نیز اگر طلاق کسی فوری اشتعال یا ہنگامے کے دوران میں دی گئی ہے تو بھی مرد کو حالات پر ٹھنڈے دل سے سوچنے کا کافی موقع مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ اب اسے عورت پر کسی قسم کا اختیار نہیں رہتا، وہ اس کی قدر و قیمت کا زیادہ صحیح اندازہ لگا سکتا ہے، ان سب باتوں کے پیش نظر امید کی جا سکتی ہے کہ وہ مصالحت کرلیں گے۔ اسی لئے فرمایا:۔

وَبُعُولَتُهُنَّ اَحَقُّ	اور اگر ان کے شوہر (عدت کے مقررہ
بِرَدِّهِنَّ فِي ذَالِكَ اِنْ	زمانے کے اندر اندر) اصلاح حال کرلیں
اَرَادُوْا اِصْلَاحًا	تو مطلقہ عورتوں کو اپنی زوجیت میں
(البقرہ ۲ : ۲۲۸)	واپس لینے کا انھیں زیادہ حق ہے۔

جہاں اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر خاوند، طلاق دے دے تو عدت کے اختتام سے پہلے وہ رجوع کر سکتا ہے، وہیں اس سے ایک اور بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ایک دفعہ کی کہی ہوئی طلاق بھی، عدت کے پورا ہو جانے کے بعد دونوں میں علیحدگی کرا دینے کے لئے کافی ہے ——

یعنی اگر مرد عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع نہ کرے، تو اس کے بعد وہ عورت آزاد ہے اور جہاں چاہے نکاحِ ثانی کر سکتی ہے۔

(۲) عِدّت کی دوسری غرض رشتۂ نکاح کی اہمیت کا اظہار کرنا ہے۔ اگر ایک خاوند سے طلاق لینے کے بعد فوراً دوسری جگہ نکاح کر لینے کی اجازت ہوتی تو نکاح کی کوئی وقعت ہی نہ رہتی اور یہ ایک کھیل ہو کر رہ جاتا، جیسے آج کل یورپ اور امریکہ میں یہ کھیل بن گیا ہے۔ نکاح ایک مقدس رشتہ ہے، جو خدائی احکام کے تحت، بقائے نسلِ انسانی کے لیئے قائم کیا جاتا ہے۔ اگر انسان اُسے محض اپنے شہوانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنالے، تو وہ گویا احکام خداوندی اور بنی نوع انسانی سے تمسخر کر رہا ہے۔

(۳) عدت کا تیسرا مقصد، نسب کی حفاظت ہے۔ ممکن ہے کہ طلاق کے وقت عورت کو صرف چند دن کا حمل ہو۔ اگر اسے فوراً دوسری جگہ نکاح کر لینے کی اجازت ہوتی، تو اولاد سے متعلق یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ یہ کس خاوند سے ہے۔ بخلاف اس کے اگر عورت تین ماہ تک نکاح نہ کرے، تو حمل کے آثار نمایاں ہو جائیں گے۔ کیونکہ طبی لحاظ سے یہ ممکن ہے کہ ایام کے زمانے میں پہلے دو ایک ماہ تھوڑا بہت خون بھی آتا رہے اور عورت کو حمل بھی ہو۔ جیسے حیض کا بند ہو جانا، حمل کا قطعی ثبوت نہیں ہے، اسی طرح، خون کا جاری ہونا بھی کے قطعی مخالف شہادت نہیں۔ لیکن عام طور پر تین ماہ کے جنین کی نقل و حرکت، شکمِ مادر میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس لیئے کہا کہ تین ماہ تک عورت نکاحِ ثانی نہ کرے۔ تاکہ یہ فیصلہ ہو جائے کہ اسے پہلے خاوند سے حمل تو نہیں اور اس طرح اولاد کا نسب محفوظ رہے۔

(۴) چوتھی مصلحت، جو در اصل مندرجۂ صدر وجہ ہی سے پیدا ہوتی ہے،

وہ ورثہ کی صحیح تقسیم ہے۔ یعنی یہ معلوم ہو جائے کہ بچّہ کس خاوند کا وارث ہوگا۔

(۵) عدت کی ایک اور غرض یہ بھی ہے کہ مطلقہ عورت کو بے جا تکلیف نہ ہو۔ اگر طلاق کے ساتھ ہی، خاوند عورت کو گھر سے نکال سکتا، تو وہ بے چاری بہت مصیبت میں مبتلا ہو جاتی۔ نہ صرف وہ بے گھر ہی ہوتی بلکہ اسے دوسری جگہ نکاح کرنے میں بھی دقت پیش آتی۔ کیونکہ اس طرح اس کے اخلاق سے متعلق شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔ اس لئے حکم دیا کہ عدّت کا پورا زمانہ اسے اپنے گھر میں رکھو اور اپنی حیثیت کے مطابق اسے خوراک، لباس وغیرہ مہیا کرتے رہو۔ اگر عورت کو گھر میں رہنے کی اجازت مل گئی، تو ظاہر ہے کہ اس کے چال چلن میں کسی قسم کا نقص نہیں۔ اب اس دوران میں وہ کسی دوسری جگہ نکاح کے مسئلے پر بھی سوچ بچار کر سکتی ہے۔

طلاق دو ہیں

بعض کینہ توز خاوند ایسا کرتے، کہ ایک دفعہ طلاق دی اور عدّت کے دوران میں رجوع کر لیا۔ پہلی طلاق کے باطل ہو جانے کی وجہ سے عدّت کا شمار ختم ہو جاتا۔ کچھ عرصہ دق کر کے پھر طلاق دے دی اور پھر عدت میں رجوع کر لیا۔ اس طرح وہ بار بار طلاق دیتے اور رجوع کر لیتے۔ اس سے عورت بے چاری ہمیشہ لٹکتی رہتی اور خاوند اس پر من مانے ستم ڈھاتے۔ قرآن نے اس معاملے میں جہاں دوسری اصلاحیں کیں، وہیں اس کا توڑ بھی پیش کر دیا۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (البقرہ ۲- ۲۲۹)	طلاق صرف دو ہیں (اس کے دو ہی رستے ہیں) عورت کو پسندیدہ طریق پر روک لینا یا اُسے حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔

یعنی خاوند طلاق کے بعد، رجوع کا حق رکھتا ہے، لیکن وہ اس حق کو صرف دو ہی بار استعمال کر سکتا ہے۔ اگر اس نے دو مرتبہ رجوع کر کے پھر تیسری مرتبہ بیوی کو طلاق دے دی ہے، تو اب اُسے رجوع کا کوئی حق نہیں۔ دو رجعتوں کے بعد اُسے آخری فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ بیوی کو رکھنا چاہتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اب کے طلاق کے بعد اُسے رجوع کا کوئی حق نہیں ہو گا۔ اس لیئے اگلی آیت میں کہا:۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ۔

(البقرہ ۲: ۲۳۰)

اور اگر وہ (تیسری مرتبہ) طلاق دے دے تو پھر وہ عورت اس کے لیئے حلال نہیں جب تک کہ وہ کسی اور شخص سے نکاح نہ کرے۔ پھر وہ (دوسرا خاوند) اسے طلاق دے۔ پھر (اس سے پہلے خاوند اور عورت) دونوں پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ ایک دوسرے کی طرف رجوع (کر کے نکاح) کر لیں بشرطیکہ انھیں یقین ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود پر قائم رہ سکیں گے۔

اگر تین طلاقیں مکمل ہو جائیں، تو اس کے بعد نہ عورت ہی اس خاوند کے گھر میں رہ سکتی ہے اور نہ طلاق دینے والے خاوند پر اس کا نفقہ ہی واجب ہے۔ کیونکہ پہلی دو طلاقوں کی صورت میں جب خاوند کو حکم دیا تھا کہ "عورت کو گھر سے نہ نکالو اور اس کے نان نفقے کا انتظام کرو" تو اس سے مقصود یہ تھا کہ ممکن ہے، عدت کے دوران میں، ان دونوں میں مفاہمت ہو جائے اور وہ رجوع

کرلیں۔ لیکن چونکہ تیسری دفعہ طلاق دے دینے کی صورت میں وہ رجوع نہیں کر سکتے، اس لیئے کوئی وجہ نہیں کہ اب عورت کو پہلے شوہر کے گھر میں بند رکھا جائے۔ چنانچہ حضرت رسول کریم صلعم نے ایسی صورت پیش آجانے پر ابو عمرو بن حفص کی بیوی فاطمہ بنت قیس کو اجازت دے دی کہ وہ شوہر کے گھر سے چلی جائے اور عدت کی میعاد دوسری جگہ گذارے[ع] (مسلم۔ کتاب الطلاق)۔ ہاں اس میں ایک استثنیٰ ہے اگر تیسری طلاق کے وقت عورت حاملہ ہو، تو اگرچہ وہ اس شوہر کے مکان میں تو نہیں رہے اس کا نفقہ اسی پر واجب ہے۔(ایضاً)

اسی سلسلے میں دوسرا حکم دیا کہ اب یہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتے، جب تک کہ وہ عورت کسی دوسرے شخص کے نکاح میں جا کر اس سے بھی طلاق نہ لے لے۔ اور اس دوسرے خاوند سے خلوتِ صحیحہ لابُدّ ہے۔ یہ نہیں کہ برائے نام نکاح کر کے اس دوسرے خاوند سے طلاق لے لی جائے بلکہ جیسا کہ آپؐ نے رفاعہ قرضی کی بیوی کے معاملے میں یہ فیصلہ فرمایا ہے (بخاری۔ کتاب الطلاق) لازم ہے کہ اس دوسرے خاوند سے تعلقات زناشوئی قائم ہوں اور پھر کسی وجہ سے طلاق ہو جائے تو اس صورت میں عورت پہلے خاوند سے دوبارہ کر لے سکتی ہے۔

ع حضرت عائشہ رضہ صدیقہ کا مذہب یہ تھا کہ تیسری طلاق کے بعد بھی عورت کو شوہر ہی کے گھر میں رہنا چاہیئے اور اس کے نان نفقہ کے لیئے بھی اس کا شوہر ذمہ دار ہوگا۔ وہ فرماتی تھیں کہ حضور علیہ السلام نے فاطمہ کو شوہر کے گھر سے جانے کی اجازت اس لیئے دی تھی کہ ان کے شوہر کا گھر غیر محفوظ اور بھیانک مقام پر واقع تھا۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الطلاق)

قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک نکاح ایک مقدس تعلق ہے۔ اگرچہ بعض مجبوریوں میں وہ طلاق کی اجازت دیتا ہے، لیکن وہ اسے ہنسی کھیل کا مقام نہیں بنانا چاہتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اگر خاوند نے کسی اشتعال کے تحت یا کسی اور وجہ سے جلدی میں بیوی کو طلاق دے دی ہے اور اب وہ اس پر پشیمان ہے، تو اُسے رجوع کے لیئے ہر طرح کی آسانی مہیا کی جائے لیکن اگر اس نے دو دفعہ کے موقع سے فائدہ نہیں اُٹھایا، تو اسے تیسری بار رجوع کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ جب خاوند کو علم ہو گا کہ اب کے میں آسانی سے رجوع نہیں کر سکوں گا بلکہ اس عورت کو ایک اور شخص سے نکاح کرنا ہو گا اور پھر یہ اس شخص کا حق ہو گا کہ وہ اسے طلاق دے یا نہ دے، تو وہ تیسری بار طلاق دینے سے پہلے اس بارے میں خوب غور و خوض کرے گا۔

طلاق کی قسمیں

یہ حکم بالکل صاف ہے۔ اس میں کوئی بات مشتبہ یا تاویل طلب نہیں۔ مگر بعض لوگوں نے اس سے عجیب و غریب مسائل کا استنباط کیا ہے :-

انھوں نے طلاق کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ (۱) احسن - (۲) حسن اور (۳) باین۔

(۱) احسن یہ ہے کہ خاوند بیوی کو ایک مرتبہ طلاق دے اور اس کے بعد تین قروء تک اس کے نزدیک نہ جائے اور رجوع نہ کرے۔ اس طرح عدت کی میعاد گذر جانے پر طلاق مکمل ہو جائے۔

(۲) حسن یعنی خاوند ہر ایک طُہر میں ایک بار طلاق کہے۔ دو بار طلاق کہنے کے بعد تک وہ رجوع کر لے سکتا ہے۔ لیکن تیسرے طُہر میں تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد وہ رجوع نہیں کر سکتا اب، بیوی کو لازماً کسی دوسرے

شخص سے نکاح کرنا پڑے گا اور اگر وہ پہلے خاوند سے دوبارہ شادی کرنا چاہتی ہے تو اُسے دوسرے خاوند سے طلاق لینا پڑے گی۔

(۴) باین یہ ہے کہ خاوند ایک ہی نشست میں یکبارگی تین دفعہ طلاق کہہ دے۔ گویا جو بات اس کو طلاق حسن کی صورت میں تین ماہ میں کرنا تھی وہ فوراً کردی۔ اور جو طلاق کہیں تین ماہ میں جاکر مکمل ہوتی وہ فوراً مکمل ہوگئی۔ اس کے بعد رجوع کے لئے یہ طلاق بھی نکاح ثانی اور دوسرے خاوند سے طلاق کی مقتضی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو ان سے صرف احسن ہی وہ طلاق ہے جس کی اجازت قرآن نے دی ہے۔

جب ایک شخص ایک ہی نشست میں تین مرتبہ طلاق کہہ کے اُسے مکمل کردیتا ہے اور اس کے بعد وہ اس وقت تک بیوی سے تعلق نہیں پیدا کرسکتا، جب تک وہ کسی دوسری جگہ نکاح کرکے وہاں سے بھی طلاق نہ لے لے۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ قرآن نے جو تین قرو، کی اجازت دی تھی، وہ کالعدم ہوگئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایام جاہلیت میں اس طرح کی طلاق کا رواج تھا لیکن اسلام نے اسے جاری نہیں رکھا۔ خود حضرت رسول کریمؐ نے تین طلاقوں کو جو ایک ہی وقت میں دی گئی تھیں، ایک ہی طلاق تصور کیا۔ رکانہ بن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بیوی سہیمہ کو طلاق باین دی (یعنی تین طلاقیں)۔ پھر میں نے اس کی خبر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلمؐ کو دی اور کہا کہ خدا کی قسم، میرا ارادہ صرف ایک ہی طلاق دینے کا تھا۔ اس پر آپؐ نے پوچھا۔ کیا واقعی خدا کی قسم تیرا ارادہ ایک ہی کا تھا۔ اس پر اُنھوں نے کہا۔ ہاں خدا کی قسم، ایک ہی کا تھا۔ اس پر حضورؐ نے انھیں رجوع کی اجازت دے دی۔

انھوں نے دوسری طلاق حضرت عمرؓ اور تیسری حضرت عثمانؓ کے عہد میں دی (ابوداؤد) حالانکہ فقہاء کے نزدیک اب وہ اپنی بیوی کو عقدِ نکاح میں نہیں رکھ سکتے تھے، جب تک کہ وہ کسی دوسرے کے نکاح میں جاکر وہاں سے بھی طلاق نہ لے لیتی۔

حلالہ جو لوگ ایک ہی مجلس میں طلاقوں کو طلاق باین قرار دیتے تھے، انھوں نے اس کے نتائج سے بچنے کے لئے حلالہ کی راہ نکالی یعنی ایک رات کے لئے مُطلّقہ عورت کا نکاح کسی اور شخص سے کر دیا جائے۔ رات بھر وہ عورت اس خاوند کے پاس رہے اور اگلی صبح اس سے طلاق لے کر پھر۔ پہلے خاوند سے نکاح کرلے۔ اس کا نام انھوں نے حلالہ رکھا، کیونکہ اس طرح وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال کی جاتی ہے۔ یہ نہایت گندہ اور قابلِ شرم رواج ہے اور خود حضرت رسول کریم نے اس پر لعنت کی ہے۔ (ابن ماجہ)۔

بلکہ حضرت رسول کریم نے ایک ہی بار تین دفعہ طلاق (یعنی طلاق باین) کو کتاب اللہ سے لعب یعنی کھیل اور تمسخر ٹھہرایا ہے۔

ابن لبید کہتے ہیں کہ کسی شخص نے آکر آپؐ کو خبر دی کہ فلاں نے اپنی بیوی کو یک بارگی تین طلاقیں دے دی ہیں۔ اس پر آپؐ غصے میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ اس طرح کتاب اللہ سے کھیلا جاتا ہے حالانکہ میں ابھی تمھارے درمیان موجود ہوں (النسائی) گویا ایک نشست میں تین طلاقیں دینے کو آپؐ نے سخت ناپسند فرمایا اور اسے شریعت سے تمسخر کے مرادف قرار دیا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ عہد نبوی میں اور ابوبکرؓ کی خلافت میں اور دو سال تک عمرؓ کی خلافت میں ایک ساتھ تین طلاقیں دینے کو ایک ہی طلاق خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا کہ جس کام میں لوگوں

کو تاخیر کرنا چاہیے تھی، وہ اس میں جلدی کرنے لگے ہیں۔ ہم اب ان کی مرضی کے مطابق حکم جاری کریں گے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم جاری کیا کہ آج سے تین طلاقیں ایک ساتھ دینے سے پوری تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ (اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں پہلے تین سال تک تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق سمجھا جاتا رہا) (مسلم۔ کتاب الطلاق) یہ حدیث بہت اہم ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اول تو عہدِ نبوی اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کے پہلے دو یا تین برس تک بھی طلاق باین کا وجود نہ تھا اور اکٹھی تین، ایک ہی کا حکم رکھتی تھیں۔ دوم جب حضرت عمرؓ نے بھی اس میں تبدیلی کی اور حکم دیا کہ آئندہ تین طلاق ایک بار کہہ دینے سے طلاق مکمل ہو جائے گی، تو ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح لوگوں پر اصل حکم کی اہمیت واضح کریں تا انھیں معلوم ہو کہ جو رعایت انھیں دی گئی ہے وہ یوں جلدی کر کے اس کے فوائد سے محروم ہو رہے ہیں۔

طلاقِ حسن بھی اپنے نتائج میں باین سے کسی طرح کم نہیں۔ کیونکہ اس میں خاوند پہلے دو قرؤ میں دو مرتبہ طلاق دینے تک رجوع کر سکتا ہے، لیکن تیسرے قرؤ میں تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد یہ طلاق بھی باین ہو جائے گی۔ اب وہ اس بیوی سے نکاح نہیں کر سکتا۔ حالانکہ قرآن میں اس کی صریح اجازت موجود ہے:۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ	اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو
فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا	اور وہ اپنی عدت کی میعاد پوری کر لیں
تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ	تو انھیں اپنے خاوندوں سے نکاح
أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا	کر لینے سے نہ روکو جب کہ وہ پسندیدہ

بَیْنَھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ ۲-۲۳۲) طریقے پر ایسا کرنے پر راضی ہوں۔

بخاری (کتاب النکاح) میں اس آیت کا شانِ نزول بیان ہوا ہے کہ معقل بن یسار کی ہمشیرہ کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی۔ جب عدت ختم ہو گئی، تو خاوند نے چاہا کہ دوبارہ اس سے نکاح کرلے۔ مرد میں کسی طرح کا نقص نہیں تھا اور عورت بھی رضامند تھی۔ لیکن معقل اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ عدت کے اندر تو رجوع ہو ہی سکتا ہے، لیکن اگر عدت کے بعد بھی وہ پھر نکاح کرنا چاہیں، تو انھیں اس کی اجازت ہے۔ لیکن طلاقِ حسن میں ایسا کرنا ناممکن ہے تاوقتیکہ حلالہ نہ کیا جائے

اس طریقے کو خود قرآن نے "ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ" قرار دیا ہے۔ کیونکہ جب پہلے خاوند ہی نے اپنی مطلقہ بیوی سے نکاح کرلیا تو دونوں کو دوسری جگہ نکاح کرنے کی مشکل سے نجات مل گئی۔

عدت کے اختتام کے بعد دوبارہ نکاح کی اجازت ایک اور جگہ سے بھی مستنبط ہوتی ہے:۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۔ (الطلاق ۶۵-۲)	پس جب وہ عدت کی میعاد ختم کر چکیں تو یا انھیں مناسب طریقے سے روک لو یا مناسب طریقے پر علیحدہ کردو۔ اور (جو کچھ بھی کرو اس کے لئے) اپنے میں سے دو انصاف پسند گواہ مقرر کرلو اور یہ گواہی اللہ (کے احکام کی پابندی) کے لئے قائم کرو

فرمایا کہ عدت کے اختتام پر اگر چاہو تو انھیں معروف طریقے سے روک لو

یعنی ان سے دوبارہ نکاح کرلو یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو معروف طریقے پہ انھیں رخصت کردو۔ یعنی ان کا مہر حساب کر کے دے دو۔ حسن و احسان کا سلوک کرو۔ یہاں سے بھی عدّت کے بعد نکاح ثانی کی صریح اجازت ملتی ہے۔ روکنے سے متعلق دوسری جگہ حکم دیا:-

لَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا۔ (البقرہ ۲ = ۲۳۱)

انھیں دُکھ دینے کے لئے مت روکو، تاکہ تم ان پر زیادتی کر سکو۔

یعنی روکنے کا مقصد اصلاح اور نیک نیتی سے ان کے ساتھ رہنا ہو، نہ کہ انھیں دق کر کے تکلیف پہونچانا۔ اور اگر تم علیحدگی ہی کا فیصلہ کر لو اور انھیں مہر وغیرہ ادا کر کے رخصت کرنا چاہو، تو پھر دو عادل گواہ رکھ لو، جن کی موجودگی میں اُسے رخصت کردو، تاکہ بعد میں کسی قسم کا جھگڑا نہ پیدا ہو۔

غرضیکہ قرآن سے صرف ایک طرح کی طلاق کا جواز ثابت ہے۔ جسے یہ لوگ احسن کہتے ہیں یعنی خاوند بیوی کو حالتِ طہر میں طلاق دے۔ اس کے بعد تین قروء تک اس سے مقاربت سے اجتناب کرے اور یوں عدّت ختم ہو جائے۔ خاوند عدّت کے دوران میں بھی رجوع کر سکتا اور اگر بیوی راضی ہو تو عدّت ختم ہو جانے کے بعد دوبارہ نکاح کر لے سکتا ہے۔ ایک وقت میں ایک دفعہ کہی ہوئی یا تین دفعہ کہی ہوئی طلاق ایک ہی شمار ہوگی اور اس کے بعد تین قروء کی عدّت گزاری جائے گی اور طلاق اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک عدّت ختم نہ ہو جائے۔ قرآن سے طلاقِ حسن یا طلاقِ باین کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

طلاق اور مہر

طلاق کے جو احکام اوپر بیان ہوئے ہیں، ان پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک بات کا بیان

ضروری ہے کہ اگر خاوند طلاق دے تو، اس کے لیے اداشدہ مہر کا کوئی حصہ واپس لینا یا نااداشدہ بقایا کا کوئی حصہ روک رکھنا ہرگز جائز نہیں۔

لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا	اور تمھارے لیے یہ حلال نہیں کہ تم
مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا	دیئے ہوئے (مہر میں سے) کوئی حصّہ
(البقرة ۲ = ۲۲۹)	عورت سے واپس لے لو۔

نہ صرف یہی کہ مہر کے واپس لینے کو ناجائز ٹھہرایا، بلکہ تیسری طلاق کے بعد رخصت کرنے سے متعلق حکم دیا:-

تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (۲ = ۲۲۹)	انھیں حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کرو۔

گویا مہر کے علاوہ کچھ اور احسان بھی کرو اور انھیں رخصت کردو، کیونکہ طلاق کے معاملے میں عورت زیادہ نقصان میں رہتی ہے۔ اس لیے اس کے نقصان کی کچھ تلافی اس احسان سے کرنے کا حکم دیا۔ بلکہ اس طلاق سے متعلق جو قبل از مساس ہو، خاص طور پر فرمایا:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم مومن
نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ	عورتوں سے نکاح کرو اور پھر ان کو چھونے
طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ	سے قبل ہی انھیں طلاق دے دو، تو
تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ	ان عورتوں پر عدّت کا کوئی حکم نہیں،
عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ	جسے تم شمار کرسکو۔ پس انھیں کچھ مال
سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۔ (الاحزاب ۳۳ - ۴۹)	دے کر عمدگی سے رخصت کردو۔

گویا اس صورت میں عدّت کوئی نہیں۔ عورت طلاق کے فوراً بعد دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔ کیونکہ جن وجوہ سے عدّت کی ضرورت پیدا ہوتی ہے، وہ ابھی قائم ہی نہیں ہوئیں۔ رہا اس صورت میں مہر کا سوال، تو

اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ نہ خاوند نے بیوی کو مس کیا ہو اور نہ ابھی مہر ہی مقرر ہوا ہو اور دوسرے یہ کہ مس تو نہ کیا ہو لیکن مہر مقرر ہو چکا ہو۔ پہلی صورت کے لیئے کہا:۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّ مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ○

(البقرہ ۲ - ۲۳۶)

اس میں تم پر گناہ نہیں کہ تم نے نہ ابھی عورت کو ہاتھ لگایا ہو اور نہ اُس کا مہر ہی مقرر کیا ہو کہ اُسے طلاق دے دو (البتہ ایسی صورت میں) اس عورت کو کچھ فائدہ پہنچاؤ جو دستور کے مطابق ہو۔ امیر اپنی حیثیت کے مطابق دے اور غریب اپنی حیثیت کے مطابق۔ یہ نیکی کرنے والوں پر ایک فرض ہے۔

یہ غیر معمولی حسن و احسان ہے ۔عورت کا مہر ابھی مقرر نہیں ہوا اور خاوند نے ابھی اُسے چھوا تک نہیں، لیکن کسی مجبوری کے سبب طلاق کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ عورت کا کوئی حق نہیں کہ وہ مرد سے کچھ طلب کر سکے، لیکن چونکہ نکاح کا رشتہ باندھنے اور پھر اُسے توڑ دینے سے عورت کو تکلیف اور ذہنی کوفت ہوئی ہے، اس لیئے قرآن نہیں چاہتا کہ اس کی یہ تکلیف بھی بلا معاوضہ رہ جائے ۔اس لیئے کہا کہ اگر تم نیک شعار اور تقویٰ پسند ہو تو اس عورت کے اس نقصان کی تلافی اس طرح کر دو، کہ اپنی حیثیت کے مطابق اسے کچھ دے دو۔ تھوڑا یا بہت، جو کچھ تم آسانی سے دے سکتے ہو۔ خدا کسی پر اس کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ۔لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲ - ۲۸۶)

خود حضرت رسول کریم صلعم کا اُسوہ حسنہ، دلیل راہ ہے۔ دختر جون ابھی آپ کے نکاح میں نہیں آئی تھی، کہ آپ نے اُسے اس کی درخواست پر اس کے اعزہ کے پاس بھیج دیا۔ اور چلتے وقت حکم دیا کہ اُسے سپید کتاں کے دو تھان دے دیئے جائیں۔ (بخاری۔ کتاب الطلاق)۔ حالانکہ نہ نکاح ہوا تھا اور نہ یہ طلاق ہی تھی، لیکن آپ نے اس صورت میں بھی احسان اور سلوک کو فراموش نہیں کیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مہر تو مقرر ہو چکا ہو، لیکن ابھی خلوت نہیں ہوئی اور طلاق ہو جائے۔ اس سے متعلق اگلی آیت میں حکم دیا:۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّا اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔

(البقرہ ۲ = ۲۳۷)

اور اگر ایسی صورت ہو کہ تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے بیوی کو طلاق دے دی ہو اور جو کچھ مہر مقرر کرنا تھا، وہ مقرر کر چکے ہو تو (اس صورت میں) مقررہ مہر کا آدھا (ادا کر دو) سوائے اس کے کہ عورت اپنی خوشی سے معاف کر دے یا وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کا سررشتہ ہے وہ ہی (پورا دے کر اپنے آدھے کے حق سے) درگذر کرے اگر تم درگذر کرو تو یہ تقویٰ کی بات ہے۔ آپس میں احسان کرنا نہ بھولو اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کو خوب دیکھتا ہے۔

یوں عورت کو صرف خلع طلب کرنے کی صورت میں مہر واپس دینے کو کہا گیا ہے، جس کا بیان آگے آتا ہے۔ یہاں اس سے کہا کہ اگر تم اپنی خوشی سے مہر نہ لو یہ اچھی بات ہے۔ مگر آخری حصّے کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، جہاں خاوند کو پورا مہر دینے کی ہدایت کی ہے اور اُسے افضل کہا ہے۔ اس پر لازم صرف نصف مہر کی ادائی ہے، لیکن اگر وہ سارا ادا کر دے تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

خُلع جب خاوند کسی سبب سے عورت سے علیحدگی اختیار کرے، تو اُسے طلاق کہتے ہیں۔ لیکن اسلام، عورت کو بھی اس بات کا اختیار دیتا ہے کہ اگر وہ کسی سبب سے خاوند کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی، تو علیحدگی اختیار کر لے۔ اسے شرعی اصطلاح خلع کہتے ہیں۔ اصولاً قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ مرد اور عورت، اللہ تعالیٰ کے ٹھہرائے ہوئے قانون کے تحت، خوش و خرم ازدواجی زندگی بسر کریں، اس لئے اگر کسی طرح کا اختلاف ہو جائے تو پہلے عورت کو پوری کوشش کرنا چاہئیے کہ وہ شوہر سے صلح کر لے اور نوبت خلع تک نہ پہونچے۔ اگر ایسی ہی بات ہو کہ وہ کسی طرح بھی اس کے ساتھ رہنے کو برداشت نہ کر سکے اور اُسے اندیشہ ہو کہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے گی تو وہ خلع کرا سکتی ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ

اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں (میاں بیوی) اللہ کی ٹھہرائی ہوئی پابندیوں کے تحت، ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کر سکتے تو پھر ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ بیوی (آزادی حاصل کرنے کے لیے) خاوند کو (اپنے مہر کا کچھ حصہ

بطور معاوضہ دے دے (اور یوں آزادی ـــہ۔
حاصل کرلے) البقرہ ۲: ۲۲۹)

گویا طلاق کی طرح، خلع کی اجازت بھی صرف اس صورت میں دی، جب حُدُودُ اللہ کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو۔ خاوند اور بیوی کے جو حقوق اور فرائض ہیں، ہم ان کا بیان کر چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ان کی ادائی سے معذور ہوں۔ اس صورت میں اگر بیوی علیحدگی چاہے اور خاوند اسے آزاد کرنے پر تیار نہ ہو، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کشمکش میں دونوں احکام شریعت کو توڑ کر اس کی سزا سے بچنے کے لیے حیلے تلاش کرنے لگ گیں۔ ایسی صورت میں چونکہ علیحدگی کی خواہش عورت کی طرف پیش ہوئی ہے، اس لیے کہا، کہ اگر تم خاوند سے گلو خلاصی کرانے کے لیے کچھ قربانی کرو اور اپنے مہر کو بھی چھوڑ دو تو اس میں کیا حرج ہے۔ کیونکہ اس علیحدگی سے تمھیں آئے دن کی ذہنی اور روحانی تکلیف سے نجات مل جائے گی اور اس کے علاوہ حدود اللہ کے ٹوٹنے کے امکانات کم ہو جانے کی وجہ سے تم گناہ سے بھی محفوظ ہو جاؤ گی۔ لیکن اس سے پہلے خاوند سے کہا:۔

كَيْفَ تَأْخُذُونَـــهٗ — تم ان سے مہر کیسے واپس لے سکتے ہو
وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ — حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے
اِلٰى بَعْضٍ (النساء ۴: ۲۱) — ہو۔

پس اگر مرد، خلع کی درخواست کرنے والی عورت سے مہر واپس نہ لے اور اُسے آزاد کر دے، تو وہ اپنے اس حق کو چھوڑ کر مزید حسن و احسان کا ثبوت دے گا۔

خُلع پر پابندیاں | "فَاِنْ خِفْتُمْ" کا مخاطب یہاں حکومت یا

برادری ہے۔ کیونکہ عورت بجائے خود خلع حاصل نہیں کر سکتی، یعنی جس طرح مرد، کسی مداخلت کے بغیر بیوی کو طلاق دے سکتا ہے، عورت ایسے ہی خود بخود مرد سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کی درخواست پر مرد اسے طلاق دے دے تو بہتر، لیکن اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کر دے تو لازماً اُسے عدالت میں درخواست کرنا پڑے گی۔ یہ گویا اس کی جلد بازی پر پہلی پابندی ہے۔ دوسری پابندی مہر کی واپسی ہے۔ جس طرح خاوند طلاق دینے سے پہلے سوچ لے گا، کیونکہ اُسے عورت کا مہر فوراً ادا کرنا پڑے گا، اسی طرح عورت بھی غور وفکر کرلے گی۔ کیونکہ جہاں اسے خلع کے لئے معقول ثبوت مہیا کرنا ہوگا، وہیں مہر سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

جس طرح قرآن نے طلاق کی وجوہ پر بحث کرنے سے اجتناب کیا ہے، اسی طرح یہاں بھی "حدود اللہ" کی جامع اصطلاح بیان کر کے خلع کے اسباب پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پرہیز کیا۔ ایسے مسائل میں تمام حالات کا احاطہ کر لینا محال ہے۔ زمان ومکان کی تبدیلی سے حالات بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ہر ایک زمانے اور ملک کا تمدن الگ ہے، اس لیئے اس کی ضرورتیں بھی الگ ہیں۔

خلع کا قانون

خلع کے قانون پر ثابت بن قیس کی دو بیویوں کے نظائر سے بہت روشنی پڑتی ہے اور یہ دونوں گویا خلع کے قانون کی بنیاد ہیں۔

ثابت بن قیس بن شماس کی پہلی بیوی جمیلہ بنت عبداللہ بن سلول تھیں۔ جمیلہ، اسم بامسمّٰی حسین عورت تھی اور ثابت بہت کم رو تھے اور یہی جمیلہ کی اس سے نفرت کا باعث تھا۔ چنانچہ جمیلہ، بارگاہ نبوی میں حاضر

ہوئی اور عرض کی کہ میں ثابت سے خلع کی خواہش مند ہوں۔ مجھے اس کے دین اور اخلاق کے خلاف کوئی شکایت نہیں مگر مجھے اسلام میں کفر ناپسند ہے (بخاری۔ کتاب الطلاق) یعنی مجھے اس کی ذات سے اتنی نفرت ہے کہ مجھے اپنے لغزش کھا جانے کا اندیشہ ہے جو کفر ہے۔ یا مومنہ عورت کا فرض ہے کہ وہ شوہر کی ہر طرح خدمت اور اس سے محبت کرے اور یہ مجھ سے ممکن نہیں اور اس طرح میں اسلام میں رہتی ہوئی کافروں والے اعمال کی مرتکب رہتی ہوں۔ حضرت نبی کریم صلعم نے اس سے پوچھا کہ کیا تو ثابت کا دیا ہوا باغ اُسے واپس دینے کو تیار ہے۔ جمیلہ نے کہا "ہاں بلکہ اگر وہ سے زیادہ چاہے تو وہ بھی دیتی ہوں"۔ آپؐ نے کہا زیادہ نہیں، باغ کافی ہے۔ اس پر آپؐ نے ثابت کو حکم دیا کہ جمیلہ سے اپنا باغیچہ لے لے اور اُسے طلاق دے دے۔

ثابت کی دوسری بیوی حبیبہ بنت سہل انصاریہ تھیں۔ اگرچہ ابوداؤد (کتاب الطلاق) میں حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ ثابت نے اُسے اس قدر پیٹا تھا کہ اس کی ہڈی ٹوٹ گئی، لیکن ایک دوسری حدیث (ابن ماجہ، نیز مؤطا امام مالک) سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیبہ کو ثابت کے خلاف وہی شکایت تھی یعنی وہ بھی اس کی شکل پسند نہیں کرتی تھی۔ حبیبہ نے کہا کہ جو کچھ ثابت نے مجھے دیا ہے، وہ حاضر ہے، یہ اسے لے لے اور مجھے آزاد کر دے۔ میری اور ثابت کی نبھ نہیں سکتی۔ اس پر حضور علیہ السلام نے ثابت سے کہا کہ اس سے مال لے لو اور اسے الگ کر دو۔ چنانچہ وہ خلع کرا کے اپنے والدین کے پاس چلی گئیں۔

یہ دونوں مقدمے بہت اہم ہیں اور اس سے خلع کا قانون وضاحت سے معلوم ہو جاتا ہے۔ سورۂ بقر کی مندرجہ صدر بنیادی آیت (۲۲۹) اور ان مقدمات

اور ان کے فیصلوں کو یکجا کرنے سے مندرجۂ ذیل اصول مترتب ہوتے ہیں:-

(۱) عورت خلع کا مطالبہ صرف اسی صورت میں کرے، جب اسے حدود اللہ کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو۔ قرآن طلاق کی طرح خلع کو بھی پسند نہیں کرتا۔ اسی لیئے اس نے یہ اجازت دیتے ہوئے "لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا" کے الفاظ استعمال کیئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورت کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تو اُس کا خلع طلب کرنا گناہ ہے۔

(۲) جیسے طلاق دینے میں مرد کو کچھ قربانی کرنا پڑتی ہے یعنی وہ بیوی سے مہر یا دوسرے مال کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا، اسی طرح عورت علیحدگی کی خواہش مند ہے تو وہ کچھ قربانی کرے اور خاوند کا دیا ہوا مہر یا اس کا کچھ حصہ واپس کردے۔

(۳) خلع کے لیئے بھی (طلاق کی طرح) قاضی یا عدالت کی مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر میاں بیوی' باہمی رضامندی سے، شرائط طے کرلیں یعنی بیوی معاوضہ دینے پر تیار ہو اور خاوند اتنے معاوضے پر رضامند ہو تو وہ خود بخود علیحدہ ہو جائیں۔ ہاں اگر وہ باہمی فیصلہ نہ کرسکیں تو قاضی یا عدالت کے پاس جائیں۔

(۴) عدالت (قاضی) کو میاں بیوی میں اختلافات کے اسباب سے کھوج کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ حتمی طور پر ثابت ہو جائے کہ بیوی کسی طرح شوہر کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں' تو وہ خلع کرادے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ بیوی کو شوہر کے خلاف کوئی ایسی شکایت ہو یا شوہر سے نفرت کا کوئی ایسا سبب ہو جسے وہ علی الاعلان ظاہر نہ کرنا چاہے۔ پس قاضی کا کوئی حق نہیں کہ وہ اسے اس کے اظہار پر مجبور کرے۔ اُس کے مقصد کے لیئے اتنا ہی کافی ہے کہ بیوی

اب خاوند سے نباہ نہیں کر سکتی اور نکاح کا مقصد فوت ہو رہا ہے۔

(۵) اگر عورت خلع طلب کرے تو شوہر اُسے آزاد کرنے پر مجبور ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنا دیا ہوا مال اس سے لے سکتا ہے۔ رُبَیّعَ بنت مُعَوّذ بن عضراء نے اپنے شوہر سے خلع کا مطالبہ کیا تھا۔ شوہر نے انکار کر دیا۔ حضرتِ عثمانؓ کے پاس قضیہ پہنچا تو آپ نے حکم دیا کہ تو اس کا موباف تک لے لے لیکن اسے الگ کر دے۔ غرض یہ کہ وہ معاوضہ تو مانگ سکتا ہے، لیکن بیوی کو اس کی مرضی کے خلاف روک نہیں سکتا۔ اور یہ معاوضہ بھی اس مہر سے زیادہ نہیں ہو سکتا، جو اس نے بیوی کو دیا تھا۔ یہی حکم حضرتِ رسولِ کریم صلعم نے جمیلہ کی درخواستِ خلع پر دیا اور یہی قرآن کے الفاظ سے مستنبط ہوتا ہے (حضرت امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ اگر عورت اپنے مہر سے کچھ زیادہ بھی دے دے تو اس میں کچھ حرج نہیں)

(۶) خلع کے بعد اگر وہ دونوں دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو اس میں کوئی بات مانع نہیں۔ لیکن چونکہ شوہر نے بیوی سے معاوضہ لے لیا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اب عدّت کے زمانے میں رجوع نہیں کر سکتا۔ دوبارہ باقاعدہ نکاح ہوگا اور وہ اس کا مہر از سرِ نو ادا کرے گا۔

اسلام نے عورت کو خلع کا حق دے کر اس پر بہت بڑی ذمہ داری عاید کر دی ہے۔ اس لیے چاہیے کہ اسکے استعمال میں نہایت درجہ احتیاط سے کام لے۔ ثوبان سے روایت ہے کہ جو عورت بلا وجہ اپنے شوہر سے خلع چاہتی ہے، اس پر جنّت حرام ہے (ابو داؤد۔ ابن ماجہ) ایک اور جگہ بار بار خلع طلب کرنے والی عورتوں کو منافق قرار دیا ہے۔

پانچواں باب

وراثہ

اسلام نے دولت کی تقسیم میں اعتدال قائم رکھنے کے لیئے چند ایسے بنیادی اصول بنائے ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو آج کل کا معاشری ہیجان بڑی حد تک خود بخود فرو ہو جائے۔ سب سے پہلے زکوٰۃ کا حکم دیا کہ امیر اپنی آمدنی پر نہیں بلکہ اپنے راس المال پر ایک خاص شرح سے ٹیکس دیں، جو قومی بیت المال میں جمع ہو کر تمام رعایا کی ضرورتوں پر خرچ ہو۔ زکواۃ کے مقرر اور واجب ٹیکس کے علاوہ لوگوں کو صدقات دینے کا حکم دیا، تاکہ مال امیروں کے پاس سے نکل کر غریبوں اور مستحقوں تک پہنچتا رہے۔ پھر سود لینے اور دینے کی ممانعت کی۔ دراصل بہت سی خرابیوں کی جڑ سود میں پنہاں ہے۔ سود لینے والا اور سود دینے والا دونوں آخر کار نقصان میں رہتے ہیں۔ چوتھا حکم وصیت سے متعلق دیا کہ آسودہ حال لوگ اپنی موت سے پہلے ایک تہائی جائداد تک کی وصیت کریں۔ اس مال سے رفاہ عامہ کے بیسوں کام چل سکتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں وراثت کے احکام کچھ ایسے طریقے پر وضع کیئے کہ ان پر عمل کرنے سے سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع نہیں رہ سکتا۔ اس جگہ ہم پہلی تین شقوں یعنی زکواۃ

اور صدقہ اور سود پر بحث نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ البتہ وصیت اور قانونِ وراثت پر قرآن کی روشنی میں غور کریں گے۔

وصیت

قرآنِ کریم نے جہاں بھی ترکے کی تقسیم کا حکم دیا ہے، اس سے پہلے وصیّت کی تعمیل اور میّت کے قرض کی ادائی کے لئے کہا ہے۔ وصیّت اور قرض سے متعلق یہ احکام ایسے ہیں کہ عورت ہو یا مرد، ان کی تعمیل سب پر واجب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ (البقرہ ۲ – ۱۸۰)	تم پر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت قریب آجائے، تو اگر وہ اپنے والدین اور اقربا کے لئے بڑا سرمایہ ترکے میں چھوڑ رہا ہے تو وہ دستور کے مطابق اچھی طرح وصیت کرے۔ یہ متقیوں پر ایک فرض ہے۔

بعض مفسّرین نے اس آیت کو سورۂ نساء کی ورثہ والی آیات سے (جن کا ذکر آگے آتا ہے) منسوخ قرار دیا ہے۔ حالانکہ ان ہی آیتوں میں چار جگہ ترکے کی تقسیم سے پہلے وصیّت کی تعمیل اور قرض کی ادائی کا حکم موجود ہے۔ اس کے علاوہ سورہ مائدہ میں وصیّت کو قلم بند کرنے اور اس سے متعلق شہادت مہیّا کرنے کی ہدایات درج ہیں۔ اور سورۂ مائدہ ان سورتوں میں سے ہے، جو حضرت رسول کریم صلعم کی زندگی کے آخری ایّام میں نازل ہوئیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وصیّت والی آیت منسوخ نہیں۔ قرآن کی ان کی اندرونی شہادتوں کے علاوہ حضرت رسول کریمؐ، اپنی زندگی کے آخری زمانے تک وصیّت کی اجازت دیتے رہے۔

سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں حجۃ الوداع کے دوران میں ایسا سخت بیمار ہوا کہ موت کے کنارے تک پہنچ گیا۔ اس پر رسول اللہ صلعم عبادت کے لئے میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! میں کافی مال دار آدمی ہوں اور ایک بیٹی کے سوائے میرا کوئی وارث نہیں۔ کیا میں اپنے سارے مال کی وصیّت کر دوں"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "نہیں" میں نے عرض کیا۔ "دو تہائی مال کی"۔ فرمایا۔ "نہیں"۔ پھر عرض کیا۔ "آدھے مال کی کر دوں"۔ فرمایا "نہیں"۔ پھر میں نے عرض کیا۔ "ایک تہائی مال کی وصیّت کر دوں"؟ آپ نے فرمایا۔ "ہاں تہائی مال کی خیرات کرو اور تہائی بھی بہت ہوتا ہے۔ اگر تم اپنے وارثوں کو خوش حال چھوڑو، تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو مفلس اور محتاج چھوڑ دو اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں" (متفق علیہ)

اصول وصیّت

مندرجۂ صدر آیت اور اس حدیث سے وصیّت کے یہ اصول معلوم ہوتے ہیں:-

(۱) چونکہ سورۂ نساء کی آیتِ ورثہ فتح مکّہ سے پہلے نازل ہو چکی تھی، اس لیئے حجّۃ الوداع میں حضرت رسول کریمؐ صلعم کا سعد بن وقاص کو وصیت کی اجازت دینا اس امر کی صریح شہادت ہے کہ سورۂ بقر کی مندرجۂ صدر آیت منسوخ نہیں ہوئی۔

(۲) وصیت اس صورت میں جائز ہے، جب کوئی شخص اپنے وارثوں کے لیئے کافی جائداد ترکے میں چھوڑ رہا ہو۔ آیتِ زیر بحث میں بھی یہی حکم ہے کہ جب کوئی آدمی اپنے والدین اور عزیزوں کیلیے خیر یعنی مال کثیر ترکے میں چھوڑنے والا ہے، تو وہ پسندیدہ اور معروف طریقے سے وصیت کرے۔

بعض لوگوں نے اس آیت کے معنی یوں کیئے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی

قریب الموت شخص اپنے بعد مال و متاع سے کچھ چھوڑ جانے والا ہو، تو اسے چاہیئے کہ اپنے ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے لیئے اچھی وصیت کر جائے۔ لیکن یہ معنی کچھ درست نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ والدین اور رشتہ دار تو بہر صورت سورۂ نساء کے تحت وارث ہیں۔ ان کے لیئے وصیت کی ضرورت ہی نہیں ان معنوں کی تغلیط حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ کے پاس ان کا ایک آزاد کردہ غلام آیا اور کہنے لگا کہ میں اپنی سات سَو درہم کی جائداد وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا۔ یہ رقم خیر نہیں۔ تم وصیت نہ کرو۔ ایسے ہی حضرت عائشہ رضہ سے کسی نے پوچھا، کہ میرے چار وارث ہیں اور چار ہزار درہم کی جائداد ہے۔ کیا میں اس میں سے کچھ وصیت کردوں۔ تو آپ نے بھی یہی جواب دیا کہ چار ہزار درہم کی رقم خیر نہیں۔ بہتر ہے کہ اسے اپنے ورثہ کے لیئے چھوڑ جاؤ۔ گویا دونوں جگہ، خیر کا لفظ وصیت سے نہیں بلکہ اس کے بعد کے الفاظ سے متعلق قرار دیا گیا۔

(۳) وصیت کے ذریعے ورثا کو ترکے سے محروم کرنا جائز نہیں، بلکہ انھیں غنی اور محتاج چھوڑنا زیادہ مناسب ہے۔

(۴) وصیت زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی جائز ہے۔

(۵) وصیت ورثاء کے حق میں نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ انھیں تو بہر حال ترکہ ملے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور امر بھی قابلِ غور ہے کہ اگر کسی وارث کے لیئے وصیت کے ذریعے کچھ چھوڑا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اسے ترکے میں سے اپنے حصہ سے زیادہ مل جائے گا اور یوں وارثوں کے حصے مقرر کرنے کا مقصد ہی ضایع ہو گیا۔

اس نتیجے کی تائید حدیث "لا وصیة لوارث" سے بھی ہوتی جو ابو داؤد

نسائی، ترمذی، اور ابن ماجہ میں بیان ہوئی ہے) یہ اگرچہ آحاد میں سے ہے، لیکن قرآن کے کسی مقام کے منافی نہ ہونے کے سبب قابل اعتبار رہی
وصیت کرنے والا جہاں اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی جائداد کے تیسرے حصّے تک کی کسی طرح وصیت کردے مثلاً اگر بعض رشتے دار ایسے ہوں کہ احکامِ وراثت کی رو سے اُنھیں کچھ نہیں ملے گا، تو وہ وصیت کے ذریعے اُنھیں کچھ دے سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازم ہے کہ وہ وارثوں کو نقصان پہنچانے کی خاطر، دوسروں کے لیئے وصیت نہ کرے۔

بعض لوگ اپنی اولاد میں سے کسی خاص بچے کے ساتھ مانوس ہوتے ہیں کہ اسے کچھ زیادہ مل جائے۔ چونکہ وہ وصیت کے ذریعے اس سے خاص رعایت نہیں کر سکتے، اس لیئے وہ یہ حیلہ کرتے ہیں کہ اپنی زندگی ہی میں اسے کچھ دے دیتے ہیں۔ یہ بھی ناجائز ہے۔ سب بچوں سے یکساں سلوک کرنا چاہیئے۔ اگر ایک کو کچھ دیا جائے، تو دوسروں کو بھی دینا چاہیئے۔ حضرت نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ میرے والد نے مجھے کچھ عطیہ دیا (ایک روایت میں ہے کہ میرے والد نے مجھے ایک غلام دیا تھا)۔ میری والدہ عمرہ بنت رواحہ نے اُن سے کہا کہ میں تو جب خوش ہوں گی جب تم اس پر رسول کریم صلعم کو گواہ بنالو۔ جب میرے والد نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے پوچھا "کیا تم نے اپنے سب بچّوں کو اتنا ہی دیا ہے؟" میرے والد نے جواب دیا "نہیں" تو فرمایا۔ "خدا سے ڈرو اور اولاد کے درمیان عدل سے کام لو"۔ یہ سُن کر میرے والد پلٹ آئے اور عطیہ واپس لے لیا (متفق علیہ)

(٦) اگر کوئی شخص غلط وصیت کرنے کا ارادہ کرئے تو دوسروں کا فرض ہے کہ وہ اُسے روکیں۔

(۷) وصیت کسی غیر مذہب والے کے حق میں بھی کی جا سکتی ہے اور ورثاء کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کی تعمیل میں کوتاہی نہ کریں۔ بلکہ اگر مرنے والے کے کچھ مستحق رشتہ دار ایسے ہیں، جو غیر مسلم ہیں تو یہ اور بھی زیادہ مناسب ہے کہ وہ ان کے لئے وصیت کر جائے۔ کیونکہ وہ غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اس کے ترکے میں وارث نہیں ہو سکتے۔ ام المومنین حضرت صفیہ رضؓ نے مرتے وقت ایک لاکھ درہم ترکے میں چھوڑے اور وصیت کی کہ اس کا ایک تہائی میرے بھانجے کو دے دیا جائے۔ حضرت صفیہ رضؓ پہلے یہودیہ تھیں اور بعد میں اسلام قبول کرکے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں۔ لیکن ان کے یہ بھانجے ابھی تک یہودی مذہب پر قائم تھے۔ اس لئے لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل میں تامل کیا۔ اس پر حضرت عائشہ رضؓ نے پیغام بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرو اور صفیہ رضؓ کی وصیت پر عمل کرو۔ تب لوگوں نے ان کے بھانجے کا حق انھیں دیا۔

وصیّت میں تبدیلی کچھ لوگ اس لئے وصیت نہیں کرتے کہ ان کے وارث غالباً ان کی وصیت کے مطابق عمل نہیں کریں گے۔ یہ اندیشہ وصیت نہ کرنے کے لئے معقول وجہ نہیں۔ مُوصی پر عمدہ طریقے سے وصیت کرنا فرض ہے۔ اگر اس کے بعد اس کے وارث کی تعمیل میں کوتاہی کریں گے تو وہ ایک گناہ کے مرتکب ہوں گے۔ وصیت کرنے والا اس کے لئے ذمہ دار نہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (البقرہ ۲ : ۱۳۴) وہ اپنے اعمال کے لئے ذمہ دار ہیں اور تم اپنے اعمال کے لئے۔ تم سے اُن کے کئے سے باز پرس نہیں ہوگی۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تمھیں جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرو۔ حضرت رسول کریمؐ نے

وصیت کرنے کی تاکید کی ہے۔ فرمایا جو شخص وصیت کر کے مرا، وہ راہِ مستقیم اور سُنت پر مرا۔ وہ تقویٰ اور شہادت پر مرا اور اس حال میں مرا کہ اس کے لیے مغفرت ہے (ابن ماجہ)۔ غرض کہ مرنے والے کے لیے وصیت لازم ہے، بشرطیکہ وہ ورثاء کے لیے مالِ کثیر چھوڑ رہا ہو اور ورثاء کا فرض ہے کہ وہ اس وصیت کی تعمیل کریں۔

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ (البقرۃ ۲ : ۱۸۱)	پھر جو کوئی اس وصیت کو سن کر اس میں تبدیلی کرے گا، تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہو گا۔

بے شک ورثہ اور لواحقین کا وصیت میں ردّ و بدل کرنا گناہ ہے، لیکن مُوصی کا بھی فرض ہے کہ وہ وصیّت کرتے وقت کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال نہ کرے۔ تقسیمِ ترکہ کا حکم اسی وصیت کی تعمیل کے بعد ہے، جس کا مقصد کسی حق دار کو نقصان پہنچانا نہ ہو۔

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ۔ (النساء ۴ : ۱۲)	ایسی وصیت یا قرض کے بعد جس کا مقصد (حق داروں کو) نقصان پہنچانا نہ ہو۔

یعنی ایسی وصیت قابلِ عمل ہے اور وارثوں کو چاہیے کہ جائداد تقسیم کرنے سے پہلے اس کی تعمیل کریں۔ پہلے موصی کو حکم دیا کہ کوئی وصیّت، کسی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے نہ کرو۔ اس کے اعزّہ اور دوستوں کو بھی ہدایت کی کہ اگر تمھارے علم میں آجائے کہ موصی، بعض وارثوں کو نقصان اور دوسرے لوگوں کو ناانصافی سے فائدہ پہنچانے پر تلا ہوا ہے، تو تمھارا فرض ہے کہ اسے اس سے روکو۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(البقرہ ۲ - ۱۸۲)

اور اگر کسی کو اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والا کسی کی بے جا طرف داری یا گناہ کرنے والا ہے تو موصی اور اس کے وارثوں کے درمیان صلح کرا دینے میں کوئی گناہ نہیں بے شک اللہ بہت بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

یہ حکم اس لیئے دینے کی ضرورت پیش آئی، کہ پہلی آیت میں وصیت میں رد و بدل کرنے والے کو گناہ اور سزا سے ڈرایا تھا۔ اس لیئے اس بات کا اضافہ کر دیا، تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہوئے کہ اگر تم اپنے اثر سے کام لے کر موصی کو اس بات پر آمادہ کر سکو، کہ وہ اپنے ورثا کو ان کے جائز حق سے محروم نہ کرے، تو یہ وصیت میں ردّ و بدل نہیں کہلائے گا، بلکہ یہ ایک اصلاح کا کام ہے۔ جس کے لیئے نہ صرف تم سے کوئی مواخذہ نہیں بلکہ خود موصی بھی جو غلطی کرنے والا تھا، اس سے بچ کر موردِ رحمت و مغفرت ہو گا

وصیّت پر شہادت

وصیت کو معتبر اور مضبوط بنانے کے لیئے حکم دیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم میں سے کسی کی موت کی گھڑی آجائے (اور تم وصیّت کرنا چاہو) تو وصیت کے وقت دو معتبر آدمیوں کو گواہ مقرر کر لو اگر تم سفر میں ہو اور موت کی مصیبت پیش آجائے تو دو مسلمان گواہوں کے

ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ
فَأَصَابَتْكُمْ مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ
تَحْبِسُونَهُمَا مِنْ بَعْدِ
الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ
إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهٖ
ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى
وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ
اللّٰهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ
الْآثِمِينَ ○

(المائدہ ۵ : ۱۰۶)

نہ ملنے کی صورت میں) غیر مسلم گواہ بھی
رکھ سکتے ہو۔ اگر تمھیں (ان گواہوں کی
سچائی میں) کسی قسم کا شک ہو تو انھیں
نماز (یا عبادت) کے بعد روک لو۔ اس کے
بعد وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہم کسی
معاوضے میں اپنی قسم فروخت نہیں
کریں گے، خواہ (وارث) ہمارا رشتہ دار
یا عزیز ہی کیوں نہ ہو، اور نہ ہم اللہ کی
شہادت چھپائیں گے، ورنہ ہم گناہ گار
ہوں گے۔

یعنی وصیت کو مضبوط کرنے کے لیئے مومنوں میں سے دو گواہ مقرر کر لو
جو تمھارے بعد وصیت کی صحت کی تصدیق کریں تاکہ وارثوں کے درمیان
کوئی اختلاف نہ پیدا ہو۔ مجبوری کی حالت میں، مسلمانوں کے نہ ملنے کی صورت
میں، دو معتبر اور معزز غیر مسلم گواہ رکھنے کی اجازت دی۔ یہاں اگرچہ گواہوں
کے مقرر کرنے کا ذکر سفر کے ساتھ کیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ گواہ
صرف حالتِ سفر ہی میں مقرر کرو۔ بلکہ یہاں محض ایک مجبوری کی حالت کا
بیان کر کے عام اصول بیان کر دیا ہے کیونکہ سفر کی حالت میں اس حکم پر
عمل مشکل ہے، اس لیئے اجازت دی کہ اگر حالات ایسے ہوں کہ مسلمان
گواہوں کا مہیا کرنا محال ہو تو اس صورت میں غیر مسلم گواہ بھی مقرر کیئے جا سکتے
ہیں۔ البتہ معتبر اور صاحبِ عدل کی شرط ان پر بھی عائد ہوگی۔
اور صلٰوۃ کے بعد روکنے کو اس لیئے کہا، کہ جب انسان خدا کی

عبادت میں مصروف ہوتا ہے تو خشیت اللہ اس پر زیادہ طاری ہوتی ہے اور اس حالت میں وہ غالباً اپنے قول یا اقرار یا قسم کا زیادہ پاس کرے گا۔ اگر گواہ مسلم ہیں، تو انھیں نماز کے بعد روکا جاسکتا ہے۔ اگر وہ غیر مسلم ہیں، تو ان کی عبادت کے بعد انھیں مندر یا گرجے میں روکا جاسکتا ہے۔

غرض کہ لفظ صلوٰۃ یہاں عام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

آخر میں قسم کا طریقہ بیان کیا۔ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ۔ پہلے وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھائیں اور پھر قسم کے یہ الفاظ دہرائیں، لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ۔ یعنی ہم کسی معاوضے کے بدلے میں اپنی قسم نہیں بیچیں گے، خواہ وارث ہمارا رشتے دار یا عزیز قریب ہی کیوں نہ ہو، اور نہ ہم اللہ تعالیٰ کی شہادت چھپائیں گے۔ اور اگر ایسا کریں گے، تو ہم گناہ گار ہوں گے عہ

حاشیہ عہ قرآن کے مختلف مقامات سے شہادت سے متعلق مندرجۂ ذیل اصول معلوم ہوتے ہیں:-

(۱) گواہ عادل اور متقی ہو (الطلاق ۶۵=۲)
(۲) گواہ غیر مسلم بھی ہوسکتا ہے۔ (المائدہ ۵=۱۰۶)
(۳) عورت بھی گواہ ہوسکتی ہے (البقرہ ۲=۲۸۲)
(۴) بلانے پر گواہ، گواہی دینے کے لیے ضرور حاضر ہو اور انکار نہ کرے۔ (البقرہ ۲=۲۸۲)
(۵) گواہی کو چھپانا گناہ ہے۔ (البقرہ ۲=۲۸۳)
(۶) سچی گواہی دینا مومن کی نشانی ہے۔ (المعارج ۷۰=۳۳)
(۷) گواہی سچی اور پوری پوری دی جائے اور کسی کی مخالفت کی وجہ سے سچ سے گریز نہ کیا جائے۔ (المائدہ ۵=۸)
(۸) گواہی سچی اور مکمل دی جائے، خواہ یہ اپنے یا اپنے کسی عزیز قریب ہی کے خلاف کیوں نہ ہو۔ (النساء ۴=۱۳۵)
(۹) گواہ کو اس کی گواہی کی وجہ سے نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے۔ (البقرہ ۲=۲۸۲)
(۱۰) اگر یہ ثابت ہوجائے کہ گواہ نے جھوٹ بولا ہے تو پھر اس کی گواہی کبھی قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ (النور ۲۴=۴)

یہاں ان سب صورتوں کا بیان کر دیا، جن میں عموماً ایک شخص شہادت میں تبدیلی یا اخفاء پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ پہلے ممکن ہے کہ وہ کسی فریق سے رشوت لے کر اپنی شہادت بدلنے پر تیار ہو جائے اور اس طرح دوسرے فریق کو نقصان پہنچا کر ان لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے۔ دوسرے ممکن ہے کہ ورثار میں ایک فریق اس کا رشتہ دار یا عزیز ہو اور وہ اس سے رشوت لئے بغیر ہی شہادت، اس کے حق میں تبدیل کرنے پر تیار ہو جائے اور تیسرے یہ کہ وہ شہادت کا جتنا حصہ بیان کرے، وہ تو درست ہو اور اس میں کوئی غلط بیانی نہ ہو، لیکن وہ کوئی ایسا حصہ ظاہر نہ کرے، جس سے شہادت میں اتنی تبدیلی ہو جائے کہ اس کا اصل مقصد فوت ہو جائے۔ یہاں شہادت کو "اللہ کی شہادت" کہہ کر یہ بتایا کہ اگر گواہ ٹھیک ٹھیک سارا حال بتا دیتا ہے، تو وہ خدا کے ایک حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔ یہ کسی پر احسان نہیں کیونکہ اس شہادت کا ظاہر کرنا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہو چکا ہے۔

فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰٓ أَنَّهُمَا ٱسْتَحَقَّآ	پھر اگر معلوم ہو جائے کہ دونوں گناہ کے
إِثْمًا فَـَٔاخَرَانِ يَقُومَانِ	مرتکب ہوئے ہیں، تو پھر ان کی جگہ دوسرے
مَقَامَهُمَا مِنَ ٱلَّذِينَ ٱسْتَحَقَّ	دو گواہ، ان لوگوں میں کھڑے کیئے جائیں
عَلَيْهِمُ ٱلْأَوْلَيَـٰنِ فَيُقْسِمَانِ	جن کا حق ان پہلے گواہوں نے دبانا چاہا تھا۔
بِٱللَّهِ لَشَهَـٰدَتُنَآ أَحَقُّ مِن	پھر یہ دونوں اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہماری
شَهَـٰدَتِهِمَا وَمَا ٱعْتَدَيْنَآ	گواہی پہلے گواہوں سے زیادہ درست ہے اور
إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ○	اگر ہم گواہی دینے میں کسی قسم کی زیادتی کریں گے
(المائدہ ۵ : ۱۰۷)	تو ہم ظالموں میں سے ہوں گے۔

یہاں بھی اللہ کی قسم کھانے کے بعد جو الفاظ کہیں گے لکھ دیئے ہیں یعنی

شَهَادَتُنَا اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا اِنَّا اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔

قرائن کی شہادت

پہلے گواہوں کے جھوٹ بولنے کا علم قرائن ہی سے ہو سکتا ہے۔ قرآن نے قرائن سے شہادت مرتب کرنے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ سورۂ یوسف میں جہاں عزیز مصر کی عورت کے حضرت یوسف علیہ السلام پر اتہام لگانے کا ذکر ہے۔ وہاں اس عورت کے لوگوں ہی میں سے ایک نے کہا، کہ اگر حضرت یوسف کی قمیص سامنے دامن سے پھٹی ہوئی ہے، تو واقعی یہ عورت اپنے دعوی میں سچی ہے۔ اور اگر ان کی قمیص پشت کی طرف سے پھٹی ہے تو یہ جھوٹی ہے اور حضرت یوسف بے گناہ ہیں۔ پس اگر مدعی یا مدعا علیہ قرائن سے یہ ثابت کر دے کہ فریق ثانی اپنے دعوی میں یا گواہ اپنی شہادت میں ایسے امور بیان کر رہا ہے جو اس مرنے والے شخص کے حالات یا محلِ وقوع کو مدنظر رکھتے ہوئے قرین قیاس نہیں، تو وہ ان کے مقابلے میں، اپنی طرف سے جوابی شہادت پیش کر سکتا ہے۔

چونکہ سفر اور مجبوری کی حالت میں غیر مسلم گواہوں کے تقرر کی اجازت دی ہے، اس لئے لازم ہے کہ ان کی شہادت کی خوب چھان بین کر لی جائے۔ بعد میں پشیمان ہونے سے پہلے احتیاط کر لینا زیادہ عقل مندی ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی
اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ	فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے
فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا	تو اس کی چھان بین کر لیا کرو، تاکہ ایسا
قَوْمًا بِجَهَالَةٍ	نہ ہو، کہ عدم واقفیت کی وجہ سے کسی
فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ	گروہ کو نقصان پہنچا بیٹھو اور بعد میں

نَادِمِیْنَ ○ (الحجرات ۴۹: ۶) تمھیں اپنے کیئے پر نادم ہونا پڑے۔

اس آیت میں دو لفظ قابلِ غور ہیں، ایک فاسق اور دوسرا نبار۔

فاسق اس شخص کو کہتے ہیں، جو احکامِ شریعت کی نافرمانی کرتا ہے یا ایک عہد کرکے اس سے مکر جاتا ہے۔ اور نبار کے معنی ہیں کوئی اہم ضروری خبر۔ فرمایا اگر کوئی شخص تمھارے پاس کسی قسم کی اہم اور ضروری خبر لے کر آئے، تو پہلے تحقیق کرلو۔ اگر وہ آدمی بدعہد اور غیر معتبر مشہور ہے، تو اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہاں بھی قرائن سے شہادت کے سچ یا جھوٹ ہونے کا فیصلہ کرنے کی ہدایت کی۔

نیز اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خبر لانے والا آدمی معتبر ہے، تو بعض امور میں ایک آدمی کی شہادت بھی قبول کی جاسکتی ہے۔

ذَالِكَ اَدْنٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰی وَجْهِهَا اَوْ یَخَافُوْا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفَاسِقِیْنَ ○

(المائدہ ۵: ۱۰۸)

اس طرح کی قسم سے امید ہے کہ گواہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے یا کم از کم انھیں بات کا اندیشہ رہے گا کہ کہیں ہماری قسمیں دوسرے فریق کی قسموں کے بعد رد نہ کردی جائیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور (اس کے احکام کو غور سے) سنو۔ اللہ (اپنے احکام کی) خلاف ورزی کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اگر ان دونوں کو معلوم ہوگا کہ ہماری شہادت کے بعد فریق مخالف بھی شہادت پیش کرکے ہماری تردید کرسکتا ہے تو اس کا زیادہ امکان ہے کہ وہ حالات، بے کم و کاست، ٹھیک ٹھیک بتادیں گے۔ اور اس خوف سے کہ اگر

بعد میں ہماری شہادت رد کردی گئی، تو اس میں ہماری ذلت اور ہتک ہوگی، وہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔ گویا فریقِ ثانی کو شہادت کا حق دینے سے مقصود یہ ہے کہ سچ اور جھوٹ میں تصفیہ ہوسکے۔ پس اگر گواہ خود ہی مُوصی کی ہدایت کے مطابق سچی گواہی دے رہے ہیں تو اس صورت میں فریقِ ثانی کو بھی جھوٹی شہادت پیش نہیں کرنا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کی وعید سے ڈرنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ وصیّت کی تصدیق، شہادتوں کا پیش ہونا اور فریقِ ثانی کا ان کی تردید کے لیئے کھڑا ہونا اور اس کے نتیجے میں دونوں فریقوں پر جرح و تعدیل وغیرہ، یہ سب امور گھر بیٹھے طے نہیں ہوسکتے۔ بلکہ ان کے لیئے ایک عدالت کی ضرورت ہے۔ اس لیئے جہاں جھگڑا ہو اور فریقین باہمی گفتگو سے تصفیہ نہ کرسکیں تو اُنھیں عدالتِ مجاز کے سامنے جاکر اپنے دعوی کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے۔

قرض ترکے کی تقسیم سے متعلق ایک عام اصول یہ قائم کیا "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصٰى بِهَا اَوْ دَيْنٍ" یعنی وصیّت کی تعمیل اور قرض کی ادائی، کے بعد تقسیم عمل میں آئے گی۔ یہاں وصیّت کا ذکر پہلے اور قرض کا بعد میں کرنے سے یہ مراد نہیں کہ پہلے وصیّت پر عمل ہوگا۔ کیونکہ وصیت تو ترکے ہی میں ہوسکتی ہے۔ اِنْ تَرَكَ خَيْرَنِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ۔ اور ترکہ وہی ہے، جو قرض ادا کردینے کے بعد بچ رہے جب تک متوفی کی جائداد پر کچھ قرض ہے، اس کے وارث یہ نہیں کہہ سکتے کہ مورث نے یہ سب کچھ ہمارے لیئے ترکہ چھوڑا ہے۔ پس قرض کی ادائی پہلے ہوگی اور وصیّت کی تعمیل بعد میں۔ خود رسولِ کریم کا یہی طرزِ عمل تھا (ترمذی۔ ابن ماجہ)

قرض کی نوعیّت یوں بیان کی:-

دَیْنٍ غَیْرَ مُضَآرٍ — ایسا قرض، جس کا مقصد (وارثوں کو) نقصان پہنچانا نہ ہو۔
(النساء ۴ : ۱۳)

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جہاں کسی شخص کی اپنی اولاد، اس کے ترکے کی وارث نہیں ہوتی، بلکہ اس کے خاندان کے دوسرے افراد یا دور کے رشتے دار اس کے وارث ہوتے ہیں۔ وہ شخص اپنی جائداد کو اسراف سے خورد بُرد کرنے سے دریغ نہیں کرتا وہ بڑی بڑی رقمیں قرض لے گا۔ یہاں تک کہ سُود دینے سے بھی پرہیز نہیں کرے گا، خواہ اس کی شرح کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ پھر یہ قرض لے کر اُسے خرچ ایسی جگہ پر کرے گا، جہاں کوئی بڑی رقم خرچ کیے بغیر بھی آسانی سے کام نکل سکتا تھا۔ اور اس کا مقصد اس کے سوائے کچھ نہیں ہوتا کہ وارثوں کے ہاتھ کچھ نہ لگے۔ قرآن کے اس حکم کے تحت ایسے تمام قرضوں کی ادائی وارث پر لازم نہیں بشرطیکہ عدالت کے سامنے یہ ثابت کر دیا جائے کہ متوفی کو ان قرضوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی جائداد کی آمدنی، اس کے اخراجات کے لیئے کافی ہو سکتی تھی اور یہ سب کچھ اُس نے وارثوں کو نقصان پہنچانے کے لیئے کیا ہے۔

جب قرض اور وصیّت کے مرحلے ختم ہو جائیں تو باقی جائداد وارثوں میں تقسیم کر دی جائے۔

اصولِ وراثت

وراثت سے متعلق سب سے پہلے یہ اصول یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت رسول کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ نہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے نہ کافر مسلمان کا (مسلم۔ کتاب الفرائض) اسی طرح متبنیٰ بھی وارث نہیں ہوتا (بخاری۔ کتاب النکاح) نیز فرمایا کہ اسلام میں ایسا بھائی چارہ اور عہد یا قسم نہیں جو میراث کو واجب کر دے (مسلم۔ کتاب الفضائل الصحابہ)

اصول تقسیم | رہی صُلبی اولاد، لڑکے اور لڑکیاں، تو اُن میں تقسیم جائداد سے متعلق قرآن کا حکم ہے :-

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (النساء ۴ : ۷)

ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ لڑکوں کا حصہ ہے اور ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں، خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، لڑکیوں کا بھی حصہ ہے اور یہ حصے خدا کی طرف سے مقررہ ہیں۔

یعنی جہاں تک اصول کا تعلق ہے، لڑکا اور لڑکی دونوں اپنا اپنا مقررہ حصہ لینے کے حق دار ہیں اور کوئی شخص انھیں، ان کے اس حق سے محروم نہیں کر دے سکتا۔

یہ عام رواج ہے کہ جب کسی شخص کا ترکہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہونے لگتا ہے، تو ان لوگوں کے علاوہ، جو جائداد میں کسی حصے کے حق دار ہوتے ہیں، دور کے رشتے دار اور خاندان کے ایسے لوگ بھی بالخصوص غریب اور یتیم بچّے جمع ہو جاتے ہیں، جو قانون کی رو سے وارث نہیں ہوتے۔ قرآن ایسے لوگوں کو بھی نہیں بھولا۔ اس خیال سے ممکن ہے، ان کے دل میں اپنی محرومی کا خیال پیدا ہو، حکم دیا کہ ہوسکے تو انھیں بھی کچھ دے دو، تاکہ یوں ان کی اشک شوئی ہو جائے۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم

اگر تقسیم کے وقت (کوئی دور کے) رشتے دار اور یتیم اور مسکین جمع ہو جائیں، تو انھیں بھی ترکے میں سے کچھ دے دو، ورنہ کم کم

مِنْهُ وَقُوْلُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ (النساء ۴ = ۸)

ان سے اچھے طریقے پر (نرمی اور عمدگی سے) بات ہی کر لو۔

یعنی اس بات پر خداوند کریم کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھیں مال دیا ہے اور اس شکر کا عملی اظہار یوں کرو کہ ان لوگوں کو بھی اس میں سے کچھ دے دو، جو محض تمھاری وجہ سے اس ترکے سے محروم ہو رہے ہیں، جس پر اب تم قبضہ کرنے والے ہو۔ یوں بھی ہر ایک شخص کا فرض ہے کہ وہ صلۂ رحمی کا خیال رکھے اور اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کی خبر گیری کرے۔ لیکن اگر وہ یتیم اور مسکین بھی ہوں تو اس صورت میں یہ ذمہ داری دگنی ہو جاتی ہے۔

اگرچہ اوپر حَضَرَ کے معنی جمع ہونے کے لئے گئے ہیں یعنی اگر وہ آجائیں کچھ دے دو۔ لیکن حَضَرَ کے معنی موجود کے بھی ہیں خواہ وہ اس جگہ حاضر ہوں یا نہیں۔ پس کوئی امر مانع نہیں کہ اگر وہ لوگ غیر حاضر ہوں، تو بھی سلوک کے طور پر کچھ انھیں پیش کر دیا جائے بلکہ یہ حسن و احسان کا مزید ثبوت ہو گا کہ ان کی غیر حاضری میں بھی ان کا خیال رکھا جائے۔

آخر میں یہ فرمایا کہ اگر کسی وجہ سے انھیں کچھ نہ دے سکو، تو کم از کم ان سے نرمی سے پیش آؤ اور کوئی ایسی بات نہ کرو، جس سے انھیں اپنی محرومی اور مفلسی کا احساس ہو، بلکہ سختی سے پیش آنے کی جگہ ان سے عمدہ طریقے سے گفتگو کرکے عذر کر دو۔ پھر اس طریقے کی ضرورت اور اہمیت ذہن نشین کرنے کے لئے ارشاد فرمایا۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا

اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیئے کہ اگر کہیں وہ اپنے پیچھے (کم سن اور) ضعیف اولاد چھوڑ جائیں تو انھیں ان سے متعلق کس قدر اندیشہ ہو گا۔ پس اللہ سے ڈرو

سَدِیْدًا ۝ (النساء ۴: ۹) اور مناسب اور بامحل بات کہو۔

مثال ایسی دی ہے جو ہر ایک انسان کو کسی نہ کسی دن پیش آنے والی ہے۔ موت کا علم کسی کو نہیں اور کون جانتا ہے کہ موت کے وقت میری مالی حالت کیسی ہو گی اور میرے بیوی بچوں کا میرے بعد کیا حال ہو گا۔ اس لیے فرمایا کہ اگر تمھاری موت کا وقت قریب آجائے تو تمھیں اپنے یتیم بچوں سے متعلق کیا کچھ اندیشہ نہیں ہو گا۔ اسی طرح خاندان کے ان یتیموں کا خیال کرو۔ ان سے حسن سلوک سے پیش آؤ اور گفتگو میں موقع و محل کا خیال رکھو۔

(۱) اولاد اور (۲) والدین کے حصّے

جہاں تک حقِ وراثت کا تعلق تھا، لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر کا درجہ دینے کے اب ان کے الگ الگ حصّے مقرر کیے:۔

یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ فَاِنْ کُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَھُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ وَاِنْ کَانَتْ وَاحِدَۃً فَلَھَا النِّصْفُ وَلِاَبَوَیْہِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ اِنْ کَانَ لَہٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَہٗٓ اَبَوٰہُ فَلِاُمِّہِ الثُّلُثُ فَاِنْ کَانَ

تمھاری اولاد سے متعلق اللہ کا یہ تاکیدی حکم ہے کہ ترکے میں لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے۔ اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں، تو ترکے میں ان کا حصہ دو تہائی ہو گا اور اگر اکیلی لڑکی ہو تو اسے آدھا ترکہ ملے گا اور (میت کے) ماں باپ میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا بشرطیکہ وہ اپنے پیچھے اولاد بھی چھوڑے۔ اگر اس کے کوئی اولاد نہ ہو اور وارث ماں باپ ہی ہوں تو ماں کے لیے ایک تہائی، اگر (ماں باپ کے ساتھ) بھائی بہن بھی ہوں،

لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (النساء-۱۱) تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہوگا۔
پھر یاد رہے کہ یہ سب تقسیم "مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ"
یعنی وصیت کی تعمیل اور قرض کی ادائی کے بعد ہوگی۔
آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ تقسیم کی اکائی لڑکی کا حصہ قرار دیا ہے، یعنی سب کے حصے لڑکی کے حصے سے گنے جائیں گے۔ گویا تمام تقسیم اس محور کے گرد گھومے گی۔ جاہلیت میں لڑکیوں کو ترکے میں سے حصہ نہیں دیا جاتا تھا جیسا کہ اکثر دوسرے مذہبوں میں اب بھی ہے۔ لیکن اسلام کی نظر میں لڑکی کو ترکے کا حصہ دینا کتنا ضروری ہے، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ پہلے تو تقسیم وراثت کی عمارت کی بنیاد ہی لڑکی کے حصے پر رکھی، پھر "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ" کہہ کر فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نہایت تاکیدی حکم ہے۔

اس آیت سے تقسیم کے یہ اصول معلوم ہوئے۔

(۱) اگر اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں ہوں تو ایک لڑکے کو ایک لڑکی سے دُگنا ملے گا اور اسی اصول پر سب ترکہ لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم ہوگا صرف لڑکوں کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ سب برابر کے حصے دار ہوں گے۔

۲۔ اگر اولاد میں لڑکا کوئی نہ ہو اور دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں۔ دو لڑکیوں کے حصے کا الگ ذکر نہیں کیا۔ لیکن جب یہ کہا، "فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ" تو فاء کا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ اس سے پہلے کے الفاظ میں دو لڑکیوں کے حصے کا بیان ہو چکا ہے کیونکہ اس ٹکڑے کے معنی ہیں "لیکن اگر (اولاد میں) لڑکیاں ہوں، دو سے زیادہ" جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لیکن سے پہلے دو لڑکیوں کا حصہ مقرر ہو چکا ہے اور اب دو سے

زیادہ کا بیان مقصود ہے۔ یہ حصہ کیا ہے؟

اس سے پہلے فرمایا کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا۔ یعنی اگر اولاد میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئے تو لڑکی کو ترکے کا ایک تہائی اور لڑکے کو دو تہائی ملے گا۔ فرض کیا، لڑکا نہیں تھا، صرف دو لڑکیاں تھیں تو اس صورت میں جو لڑکے کو ملتا یعنی دو تہائی، وہ ان دونوں لڑکیوں کو مل جائے گا۔ آیت کے بعد کے الفاظ ایسے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو اُن بھی دو تہائی ہی ملے گا۔

خود حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ان معنوں کی تائید ہوتی ہے۔ ایک صحابی سعدؓ بن ربیعہ غزوۂ اُحُد میں شہید ہو گئے۔ اُنھوں نے اولاد میں صرف دو لڑکیاں چھوڑیں۔ سعدؓ کے بھائی نے سارے ترکے پر قبضہ کر لیا اور لڑکیوں کو کچھ نہ دیا۔ اس پر سعد کی بیوہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اور شکایت کی کہ سعد کی دو لڑکیاں موجود ہیں، لیکن اُن کے چچا نے اُنھیں ان کے باپ کے ترکے میں سے ایک حصہ بھی نہیں دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حضور نے سعدؓ کے بھائی کو بلوایا اور اُسے حکم دیا کہ مرحوم کی دونوں بیٹیوں کو اُس کے ترکے میں سے دو تہائی اور بیوہ کو آٹھواں حصہ دے دو اور بقیہ خود رکھ لو (ترمذی۔ ابوداؤد)

اگر غور کیا جائے تو خود "فَوْقَ اثْنَتَیْنِ" میں بھی دو شامل ہیں۔ فوق سے یہ مراد نہیں کہ صرف دو سے اوپر ہی کا بیان ہے۔ دوسری جگہ قرآن میں جہاں غزوۂ بدر کا ذکر ہے، وہاں مومنوں کو کہا۔ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (انفعال ۸ = ۱۲) اس سے یہ مطلب نہیں کہ گردن چھوڑ کر اس سے اوپر ضرب لگاؤ، بلکہ گردن بھی اس میں شامل ہے۔ اسی طرح جب کہا۔ فَوْقَ اثْنَتَیْنِ

تو اس میں بھی دُو اور دُو سے زیادہ، دونوں صورتوں کا بیان ہے۔ اس کے
علاوہ سورۂ نساء کی آخری آیت میں دو بہنوں کا حصہ دو تہائی مقرر کیا ہے
تو ظاہر ہے کہ دو بہنوں کے حصے سے دو لڑکیوں کا حصہ کیسے کم ہوگا۔
الغرض دو یا دو سے زیادہ لڑکیوں کو دو تہائی دینے کے بعد بقیہ ایک تہائی
دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہوگی۔

۳۔ اگر اولاد میں صرف ایک لڑکی ہو، تو اسے ترکے کا نصف ملے گا۔
اور باقی نصف دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہوگا۔

۴۔ اگر اولاد کے علاوہ میت کے ماں باپ بھی زندہ ہوں، تو پہلے ان
دونوں میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا اور باقی دو تہائی مندرجہ
صدر شرح سے اولاد کو ملے گا۔

۵۔ اگر متوفی کے اولاد کوئی نہ ہو، صرف ماں باپ ہوں، تو اس صورت
میں ترکے کا ایک تہائی ماں کو اور باقی باپ کو۔

۶۔ آخری صورت یہ بیان کی کہ اگر متوفی کے ورثاء میں ماں باپ کے
علاوہ بھائی بہن بھی ہوں، تو ماں کا حصہ چھٹا ہوگا۔

ممکن تھا کہ کوئی شخص ماں باپ کو اولاد کا وارث قرار دینے پر اعتراض
کرتا۔ کیونکہ اس سے پہلے دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اولاد ہی وارث
قرار دی گئی تھی۔ اس لئے فرمایا:-

آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ
لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ
أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً
مِنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ

تمھارے باپ دادا (بھی ہیں) اور اولاد
(بھی)، لیکن تم نہیں جانتے کہ ان میں سے
نفع رسانی کے لحاظ سے کون تمھارے
زیادہ قریب ہے۔ (یہ حصے) اللہ نے

عَلِيْمًا حَكِيْمًا ٥	مقرر کیئے ہیں، بے شک، اللہ جاننے
(النساء ۴ = ۱۱)	والا اور حکمت والا ہے۔

یعنی یہ اعتراض کہ باپ دادا کیوں وارث بنائے گئے، نادانی کی بات ہے۔ اس حکم کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ انسان کے لیئے اوپر کے رشتے دار زیادہ اچھے ہیں یا نیچے کے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم خدائی حکموں پر عمل کریں اور تقویٰ اسی کا مقتضی ہے۔

۳۔ میاں اور بیوی کے حصے

پہلے اولاد کے حصے بیان کیئے تھے۔ پھر اولاد کی جائداد میں ماں باپ کا حصہ بتایا۔ اب تیسری صورت یوں بتائی:۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ	تمھاری بیویوں کے ترکے میں سے تمھارے
اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ	لیئے نصف، اگر ان کے کوئی اولاد نہ ہو۔
فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ	اور اگر ان کے اولاد ہو تو تمھارے لیئے
الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ	ایک چوتھائی ہے۔ (یہ تقسیم) ان کی وصیت
وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ	(کی تعمیل) اور (ان کے) قرض (کی ادائگی)
(النساء ۴ = ۱۲)	کے بعد ہوگی۔

اور خاوند کی وفات کی صورت میں بتایا:۔

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ	اور تمھارے ترکے میں سے تمھاری بیویوں
اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ	کا ایک چوتھا حصہ ہے اگر تمھارے کوئی
فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ	اولاد نہیں۔ اگر تمھاری اولاد بھی ہو۔ تو تمھارے
الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ	ترکے میں سے ان کا حصہ آٹھواں ہے۔
بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ	(یہ تقسیم، تمھاری وصیت (کی تعمیل) اور

اَوْ دَیْنٍ۔ (تمھارے) قرض (کی) ادا کے بعد ہو گی۔

(النساء ۴: ۱۲)

وراثت کے احکام میں قرآن نے واحد اور جمع کی صراحت نہیں کی مثلاً اس حکم کی رو سے ایک بیوی کے لیئے بھی اولاد نہ ہونے کی صورت میں ایک چوتھائی اور اولاد ہونے کی صورت میں آٹھواں حصّہ ہے اور اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان سب کو بھی یہی ملے گا۔ وہ آپس میں اُسے بحصّہ مساوی تقسیم کر سکتی ہیں۔

جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اگر خاوند یا بیوی کے ساتھ میّت کے ماں باپ بھی زندہ ہوں، تو پہلے بیوی یا خاوند کا حصہ علیٰحدہ کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد جو بچ رہے، وہ ماں باپ میں تقسیم ہو گا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کئی طرح کی مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک عورت فوت ہو جاتی ہے۔ اس کے خاوند کے علاوہ اس کے ماں باپ دونوں موجود ہیں اور اولاد کوئی نہیں۔ اس حکم کے تحت، خاوند کو نصف ملے گا۔ اور گذشتہ حکم کی رو سے ماں کو ایک تہائی اس طرح باپ کے لیئے چھٹا حصّہ بچا یعنی ماں سے نصف۔ ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے۔ پھر فرض کیجیئے کہ ماں باپ اور خاوند کے علاوہ دو یا تین لڑکیاں بھی ہیں۔ پہلے حکم کی رو سے لڑکیوں کو دو تہائی ملا اور باقی تہائی بحصّہ مساوی ماں باپ میں تقسیم ہو گیا یعنی ہر ایک کو چھٹا حصّہ۔ اس صورت میں خاوند کے لیئے کچھ نہیں بچا۔ ان مشکلوں کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ ہوا ہے کہ بیوی یا خاوند کی وفات پر، پہلے خاوند یا بیوی اپنا حصّہ اس آیت کے مطابق لے لے۔ اس کے بعد جو بچ رہے، وہ دوسرے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس صورت میں وارثوں کے درمیان تقسیم کرنے کے لیئے ترکہ وہ

کہلائے گا جو خاوند یا بیوی کا حصہ الگ کر دینے کے بعد بچ رہے گا بمثال کے طور پر، بیوی فوت ہو گئی۔ اس کے اولاد نہیں، البتہ ماں اور باپ ہیں۔ تو خاوند کو نصف ملے گا۔ باقی نصف کا ایک تہائی ماں کو اور دو تہائی باپ کو۔ یا فرض کیا، ماں باپ کے علاوہ اولاد بھی ہے۔ تو پہلے خاوند کو ایک چوتھائی ملا بقیہ تین چوتھائی میں سے، ماں اور باپ دونوں کو الگ الگ چھٹا حصہ یعنی اس کا ایک تہائی اور باقی دو تہائی، اولاد میں مقررہ اصول پر تقسیم ہو جائے گا۔

۴۔ کلالہ اب چوتھی صورت کلالہ کی ہے۔ اگرچہ کلالہ کے معنوں میں اختلاف ہے، لیکن اکثریت کا یہی مذہب ہے کہ کلالہ اس میّت کو کو کہتے ہیں جس کا نہ والد ہو نہ ولد۔ آیت کلالہ کی شان نزول میں جو حدیث حضرت جابر سے مروی ہے (ابو داؤد۔ کتاب الفرائض) اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ ابو داؤد ہی کی ایک دوسری روایت (عبد البراء بن عازب) میں یہی معنی حضرت رسول کریم صلعم سے بھی بیان ہوئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر عورت یا مرد فوت ہو جائے اور اس کے پیچھے نہ اس کا باپ ہو، نہ بیٹا، تو اس کی جائداد کی تقسیم کیسے ہو گی۔ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ اس کے اعیانی یعنی سگے بھائی بہن ہوں۔

۲۔ علاّتی بھائی بہن ہوں، یعنی باپ ایک اور مائیں الگ الگ ہوں۔

۳۔ اخیافی بھائی بہن ہوں۔ ماں ایک اور باپ علیحدہ علیحدہ ہوں۔ ان تینوں کے احکام الگ الگ ہیں۔

(۱) اگر پہلی صورت یعنی سگے بھائی بہن موجود ہوں، تو حکم دیا:۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلَالَةِ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَلَهٗ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ

(النساء ۴: ۱۷۶)

(اے نبی!) وہ تجھ سے فتویٰ پوچھتے ہیں (ان سے) کہو کلالہ کے بارے میں اللہ کا فتویٰ ہے کہ کوئی شخص مرجائے (اور) اس کی اولاد نہ ہو (نہ باپ دادا) اور اس کے بہن ہو، تو بہن کو اس کے ترکے کا نصف ملے گا۔ اور اگر بہن کے کوئی اولاد نہ ہو تو (بھائی) اس کا وارث ہوگا۔ اگر دو بہنیں ہوں، تو (اس بھائی کے) ترکے میں سے ان کا حصہ دو تہائی ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اگر بہنیں دو سے زیادہ ہوں تو وہ سب اسی دو تہائی میں برابر کی شریک ہوں گی۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ علاّتی بھائی بہن ہوں یعنی باپ ایک ہو اور مائیں الگ الگ ہوں، تو اس صورت میں حکم دیا:-

وَاِنْ كَانُوْا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا۔

(النساء ۴: ۱۷۶)

اور اگر بہت سے بھائی بہن ہوں تو پھر (تقسیم یوں ہوگی کہ) ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنے احکام کھول کر بتاتا ہے، تاکہ تم غلطی نہ کرو۔

یعنی جیسے اولاد کے درمیان، ترکے کی تقسیم کا اصول ہے —— ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر —— وہی یہاں بھی استعمال ہوگا۔

(۳) تیسری اور آخری صورت یہ ہے کہ اخیافی بھائی بہن ہوں

یعنی عورت نے ایک خاوند کی وفات کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح کرلیا اور دونوں سے اولاد ہو۔ اگر ان میں سے کوئی مرجائے اور کلالہ ہو۔

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ۔

(النساء ۴ ـ ۱۲)

اور اگر کوئی عورت یا مرد ایسی صورت میں ورثہ چھوڑ کر مرے کہ وہ کلالہ ہو اور اس کے گیلڑ بھائی بہن ہوں تو دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر یہ بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب اسی تہائی میں شریک ہوں گے۔ یہ تقسیم (میّت کی) وصیت (کی تعمیل) اور قرض (کی ادائگی) کے بعد ہوگی بشرطیکہ یہ (وصیّت اور قرض) کسی کو نقصان پہنچانے والے نہ ہوں۔

چونکہ ایسے بھائی بہنوں کی صورت میں جو ایک باپ کی اولاد نہ ہوں، وصیت اور قرض کے ذریعے انھیں نقصان پہنچانے کا زیادہ احتمال تھا، اس لیئے یہاں خاص طور پر کہہ دیا کہ صرف ایسی وصیّت کی تعمیل اور ایسے قرض کی ادائی کی جائے گی جن کا مقصد وارثوں کو نقصان پہنچانا نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری جگہوں پر جس وقت وصیت اور قرض کا بیان ہوا ہے وہ وارثوں کو نقصان پہنچانے والے ہو سکتے ہیں اور ان کی تعمیل لازم ہوگی۔ حکم سب جگہ کے لیئے ایک ہی ہے۔ لیکن چونکہ اس صورت میں اس کا امکان زیادہ تھا، اس لیئے یہاں اس کا ذکر خاص طور پر کر دیا۔

خلاصہ | مندرجۂ بالا آیتوں میں وراثت کے پانچ اصول بیان

ہیں :-

(۱) جہاں صرف اولاد ہو اور کوئی دوسرا وارث نہ ہو اور اولاد میں بھی تمام لڑکے ہوں۔ تو ترکہ ان لڑکوں میں بھی بحصۂ مساوی تقسیم ہوگا۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے گا۔ اور اسی اصول پر تمام ترکہ تقسیم ہوگا۔ اگر لڑکا کوئی نہ ہو، صرف ایک لڑکی ہو تو اُسے ترکے کا نصف ملے گا اور اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں، تو انھیں دو تہائی ملے گا۔

(۲) جہاں اولاد ہو یا نہ ہو، لیکن ماں باپ موجود ہوں۔ اگر اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصّہ اور باقی اولاد میں نمبر (۱) کے اصول تقسیم ہوگا۔ اگر اولاد نہ ہو، تو ماں کو ایک تہائی اور باقی دو تہائی باپ کو۔

(۳) اولاد نہ ہو لیکن بھائی بہن ہوں، تو ماں کو ایک تہائی کی جگہ چھٹا حصہ ملے گا۔ یہاں پھر اختلاف ہے کہ ان بھائی بہنوں کو کتنا ملے گا۔ بعض کے نزدیک، ماں کو ایک چھٹا حصّہ ملے گا، دوسرا چھٹا ان بھائی بہنوں میں تقسیم ہوگا اور باپ کو حسب سابق بقیہ دو تہائی۔ بعض کے نزدیک یہاں بھی کلالہ کا اصول حاوی ہوگا۔ یعنی اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو اُسے چھٹا حصّہ، ماں کو چھٹا حصّہ اور باپ کو دو تہائی ـــ اگر بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں، تو ان سب کو ایک تہائی، ماں کو چھٹا حصہ اور باقی نصف باپ کو۔

(۴) زوجین کی صورت میں، اگر بیوی اولاد چھوڑ کر مرے، تو خاوند کو ترکے کا چوتھائی اور باقی تین چوتھائی اولاد میں نمبر (۱) کے اصول پر تقسیم ہوگا۔ اگر اولاد نہ ہو، تو خاوند کو نصف اور بقیہ نصف دوسرے رشتے داروں کو اوپر کے قواعد کی رو سے۔ اگر خاوند اولاد چھوڑ کر مرے، تو بیوی کا آٹھواں حصہ ہے

اگر اولاد نہ ہو، تو چوتھا اور بقیہ ترکہ دوسرے رشتے داروں میں تقسیم ہوگا۔

(۵) کلالہ۔ جہاں اعیانی یا علاتی یا اخیافی بھائی بہن ہوں۔ جیسے کہ اوپر بیان ہوا۔

تقسیم میں یہ ترتیب مدِ نظر رکھی جائے گی:۔

سب سے پہلے خاوند یا بیوی کو حصہ ملے گا۔ پھر والدین کو اور پھر اولاد کو۔ اگر اولاد نہ ہو یا اولاد اور والدین دونوں میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو، تو سب سے آخر میں بھائی بہن حق دار ہوں گے۔

یہ سب اہل الفرائض کہلاتے ہیں، کیونکہ ان کے حصے نصِ قرآنی سے مقرر ہو چکے ہیں۔ اگر اہل فرائض کے حصے تقسیم کر دینے کے بعد جائداد میں سے کچھ بچ رہے تو یہ سب سے قریبی مرد رشتے دار کا حق ہے۔ (متفق علیہ)

جس شخص کا کوئی بھی وارث نہ ہو، اس کی جائداد قومی بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔ حدیث ہے:۔

"انا وارث من لا وارث لہ" جس شخص کا کوئی وارث نہیں، اُس کا میں وارث ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ساری قوم وارث ہوگی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اعتراض کا جواب بھی دے دیا جائے۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ جب اصولاً لڑکے اور لڑکی کو درجے میں ایک سطح پر رکھا تھا، تو ان کے حصے برابر کیوں نہ مقرر کیے۔ اس سے تو تو یہ ثابت ہوا کہ لڑکی کا درجہ لڑکے سے کم تر ہے۔

یہ اعتراض قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ حصے لڑکی اور لڑکے کی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر مقرر کیے گئے ہیں۔ عورت کا متکفل مرد ہے۔ مرد کا فرض ہے کہ وہ بیوی اور اولاد پر خرچ کرے۔ اس کے مقابلے میں عورت چاہے تو اپنی

ذاتی ضروریات پر بھی خرچ نہ کرے۔ پس مرد کا حصّہ زیادہ اس لیئے رکھا کہ اس کی ذمہ داری زیادہ ہے اور عورت کا حصہ کم اس لیئے رکھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی ذات کے علاوہ، کسی اور پر خرچ کرنے پر مجبور نہیں۔

یہ احکام ہیں اسلام کے توریث کے بارے میں۔ اگر کوئی ان پر عمل نہیں کرتا، تو اُسے قرآن کے ان الفاظ پر غور کرنا چاہیئے:۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خٰلِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

(النساء ۴:۱۳-۱۴)

یاد رکھو یہ اللہ کی قائم کردہ حدیں ہیں۔ پس جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ اسے جنت کے باغوں میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے اور یہ کتنی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی قائم کردہ حدوں کو توڑے گا، اُسے نارِ جہنم میں ڈالا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ رسوا کن عذاب سہے گا۔

تمت بالخیر

۱۹۲

طابع

یونائٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ

ناشر:- مصنف

سنہ ۱۹۵۱ء

بار اوّل ۱۱۰۰

سول ایجنسی --- نگار بک ڈپو لکھنؤ

قیمت فی کاپی --- تین روپیہ